دکھائے گئے ہیں، مقالہ کے آخر میں تحریک سے متعلق کتابوں کی فہرست اور مختصر تعارف بھی ہے، مقالہ پُر از معلومات اور دلچسپ تو ہے ہی، خواجہ صاحب کے دلکش اندازِ بیان اور شگفتہ نگار قلم نے اس کو مزید دلچسپ تر بنا دیا ہے، مگر تعجب ہے کہ ان کے ذمہ دار قلم نے شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبد العزیز صاحبؒ وغیرہ کے بارہ میں بعض بے سروپا اور غیر مستند روایتیں نقل کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا ہے۔

احسن العقائد و آموزگار پارسی } مرتبہ جناب مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی تقطیع خورد کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۲ و ۴۸، بلا قیمت،

پتہ: شعبۂ نشریات اسلام مولانا آزاد تعلیمی مرکز، اسرہٹہ، شاہ گنج، جونپور

پہلے کتابچہ میں ملا محمود صاحب شمس بازغہ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے عقائد سے متعلق دو مختصر رسالے شامل ہیں، معلوم نہیں ملا صاحب کا رسالہ کبھی اور بھی چھپا ہے یا نہیں، لیکن شاہ صاحب کا رسالہ بار بار چھپ چکا ہے اور اس کے فارسی و اردو ترجمے اور شرحیں بھی لکھی گئی ہیں، فاضل مرتب نے ان امور کی کوئی صراحت نہیں کی ہے، دونوں رسالوں میں اہلسنت والجماعت کے عقائد کی ترجمانی کی گئی ہے، اور بقول مرتب عقائد کی صحت ہی دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضمانت ہے اس لیے ان کی اشاعت ایک مفید علمی و دینی خدمت ہے، دوسرا رسالہ فارسی کے مبتدیوں کو ضروری مبادی و قواعد اور روزمرہ محاورات سکھانے کے لیے جدید انداز میں لکھا گیا ہے، مرتب کو فارسی زبان و ادب کا ذوق ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ سے ملا ہے، جن کی عربی کی طرح فارسی اصول و قواعد پر بھی مجتہدانہ نظر تھی، زیر نظر رسالہ میں مولانا کے اشارات مزید اضافے کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں، یہ کتابچہ نصاب میں داخل کیے جانے کے لائق اور مبتدیوں کے لیے مفید ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۹ ۔ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۲ء ۔ عدد ۵

مضامین

شذرات

اس سال جناب سیٹھ عبدالعزیز انصاری اور جناب سید شہاب الدین دیسنوی
پرنسپل صابو صدیق ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ کی دعوت پر دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ
۲۹ اپریل کو بمبئی میں ہوا، یہ دونوں حضرات ہماری مجلس انتظامیہ کے رکن بھی ہیں، اس
میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، کرنل بشیر حسن زیدی، مولانا
حافظ عمران خاں ندوی، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی، جناب سید انصاری اور راقم
نے بھی شرکت کی، جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی سفر کے دوران میں اچانک علیل ہوگئے،
ان کو لکھنؤ اسٹیشن سے واپس ہونا پڑا، ان کی عدم شرکت جلسہ میں بہت محسوس کی گئی۔

اس جلسہ میں دارالمصنفین کے اور مسائل کے ساتھ اس کے مالی استحکام پر زیادہ غور وخوض ہوا
ابتک یہ زیادہ تر اپنی مطبوعات کی آمدنی سے چلتا رہا، ۱۹۶۵ء سے ہند پاکستان کے تجارتی
لین دین کے بند ہوجانے کے بعد سے اسکی تجارتی آمدنی بہت ہی کم ہوگئی ہے، گذشتہ سات سال سے تقریباً
ساٹھ ہزار سالانہ خسارہ ہورہا ہے، جو کسی نہ کسی طرح ابتک پورا کیا گیا، لیکن آیندہ اس خسارہ کے پورے
ہونے کی امید نہیں، دو سال پہلے مجلس انتظامیہ میں یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ اس کیلئے دس لاکھ
روپے کا ایک سرمایہ محفوظ جمع کیا جائے، اس کے صدر ڈاکٹر سید محمود مرحوم نے اپنی ذاتی کوشش سے
پانچ لاکھ روپے جمع کرنے کا وعدہ فرمایا تھا، انکی وجہ سے کچھ رقم تو ضرور جمع ہوئی لیکن انکی وفات کے بعد
یہ امید باقی رہی، پھر مطبوعات کی تجارتی آمدنی کی کمی سے مالی پریشانیاں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں،
بمبئی کی مجلس انتظامیہ میں یہ طے ہوا کہ فی الحال پورے ملک میں ادارہ کے لیے چار سو دوامی اراکین

بنانے کی مہم شروع کیجائے، بمبئی ہی سے اس کی ابتدا کی گئی ہے، اور بقول کرنل بشیر حسن زیدی
شیر دلان بمبئی سے توقع ہے کہ یہاں زیادہ سے زیادہ اراکین بنجائیں گے۔ دوامی رکنیت
ایک ہزار روپے کے عطیہ سے بنائی جاتی ہے، اس کے بدلے میں پانچ سو کی قیمت کی مطبوعات
فوراً پیش کردیجاتی ہیں، بقیہ پانچ سو میں رسالہ معارف اور ہر سال کی نئی مطبوعات رکن
کی خدمت میں اس کی پوری زندگی تک پیش ہوتی رہتی ہیں، بمبئی کے علاوہ ملک کے اہل استطاعت
سے توقع ہے کہ اس طرح اس ادارہ کو اپنی مفید علمی خدمت میں سرگرم رہنے میں پوری مدد
کرینگے، اگر یہ خدانخواستہ مالی حیثیت سے ڈگمگایا تو پھر اس کو سنبھالنا بہت مشکل ہوجائے گا۔

بمبئی کے قیام میں مجلس انتظامیہ ایک علمی وفد بھی بن گئی تھی، یہاں اسلامک ریسرچ
ایسوسی ایشن عرصہ سے قائم ہے، استاذی المکرم علامہ سید سلیمان ندویؒ کی مشہور تصنیف
"عربوں کی جہازرانی" اسی کی طرف سے شائع ہوئی ہے، اس کے صدر جناب اے، اے،
فیضی صاحب ہیں، جن کا قلم کبرسنی کے باوجود ابتک مختلف سمتوں میں رواں ہے، اس کے
اہتمام میں دو مقالے پڑھے گئے، پہلا مقالہ ہندوستان کے عہد ماضی میں مذہبی رواداری کے
عنوان سے راقم کا تھا، اس جلسہ کی صدارت ڈاکٹر رفیق زکریا وزیر حکومت بمبئی نے کی،
دوسرا فاضلانہ مقالہ مولانا عبدالماجد دریابادی کا تھا، اس کا موضوع "قرآن مجید اور جدید
تقاضے" تھا، یہ کرنل بشیر حسن زیدی کی صدارت میں پڑھا گیا، تیسرے دن بمبئی کی انجمن اسلام
کی دعوت پر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے "ہندوستان کے آیندہ سماج میں اسلام کا حصہ"
کے عنوان پر ایک بہت ہی موثر اور دلنشین تقریر کی، یہ تینوں جلسے صابو صدیق انسٹیٹیوٹ
کے الطیفی ہال میں ہوئے، سامعین بڑی تعداد میں شریک ہوتے رہے، مولانا ابوالحسن علی
ندوی کی تقریر سننے کے لیے تو بڑا مجمع ہوا، اسی ہال میں ایک روز خواتین کے اہتمام میں میلاد النبی

کی ایک تقریب ہوئی تو اس میں مولانا حافظ عمران خان ندوی نے سیرۃ النبی پر ایک دلچسپ تقریر کی جس میں انھوں نے خواتین کو سیرت کے جلسہ میں پورے اسلامی آداب کے ساتھ شرکت کرنے کی تلقین کی، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی نے ایک مسجد میں کلام پاک کا درس دیا، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ابوالکلام آزاد روڈ پر اہل حدیث کی ایک مسجد اور خلافت ہاؤس میں بھی تقریریں کیں جو شوق سے سنی گئیں، بمبئی کے لوگوں کی رائے تھی کہ یہ چند دن وہاں برابر یاد کئے جائیں گے، اس سفر کی کامیابی سیٹھ عبدالعزیز انصاری کی فیاضانہ میزبانی اور جناب سید شہاب الدین دسنوی کی غیر معمولی سوجھ کی وجہ سے ہوئی جس کیلئے دارالمصنفین ان دونوں حضرات کا شکر گذار ہے

---

۲۲ اپریل ۱۹۷۲ء کو ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مدرسہ ثانوی کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد عرب کے سفیر عالیجناب شیخ انس یوسف یٰسین اور جمہوریہ شام کے سفیر استاذ حمود شوفی نے ملکر رکھا، یہ تین منزلہ ہوگی، اس کی تعمیر میں تقریباً پانچ لاکھ روپے صرف ہوں گے، ۱۹۴۷ء کے بعد سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سرپرستی میں ندوہ کے احاطے میں رواق سلیمانی، رواق رحمانی اور ڈائننگ ہال کی بڑی بڑی عمارتیں بن چکی ہیں، جن میں لاکھوں روپے خرچ ہوئے، یہ نئی عمارت ان کی برکت اور جواں ہمتی کی بدولت انشاءاللہ جلد ہی بن کر کھڑی ہو جائیگی، انکی زندگی خود تو بہت ہی متوکلانہ اور درویشانہ ہے لیکن وہ اپنی ذات کے علاوہ اور مسائل میں شیر کا دل اور شاہین کی نظر رکھتے ہیں، ندوہ کی تاریخ میں جہاں وہ اپنی گوناگوں ذاتی خوبیوں کی وجہ سے یاد کیے جائیں گے وہاں اس کی عمارتوں کے سلسلہ میں اس کے شاہجہاں بھی کہلانے کے مستحق ہوں گے، دارالعلوم ندوہ کے اراکین، اساتذہ اور طلبہ نے سعودی عرب اور شام کے معزز سفراء کا خیر مقدم ان کے رتبے اور شان کے مطابق کیا، اسی کے ساتھ اپنی خودداری اور وقار کو بھی قائم رکھا جس سے دونوں سفراء بھی متاثر ہوئے۔

مقالات

امیہ بن ابی الصلت

(ایک حکیم شاعر)

از
جناب مولانا عبدالحلیم صاحب ندوی، فاضل مصر استاد عربی جامعہ ملیہ دہلی

امیہ قبیلہ ثقیف کا شاعر اور اس کی عظمت و عزت کا نشان تھا، زمانہ جاہلیت میں جن لوگوں کو حق کی تلاش تھی، اُن میں امیہ کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے[1]، اسکی کنیت ابوعثمان تھی، پورا سلسلۂ نسب یوں ہے: ابوعثمان امیہ بن ابی الصلت بن عبداللہ بن ابی ربیعہ بن عوف الثقفی،

---

[1] جیسے ورقہ بن نوفل اور زید بن عمرو بن نفیل

زید نے بت پرستی چھوڑ رکھی تھی، اور بت پرستوں کا ذبیحہ بھی نہیں کھاتا تھا، کہتے ہیں کہ اس کے عقائد بالکل مسلمانوں جیسے تھے، اور عین ممکن تھا کہ وہ اسلام لے آتا لیکن بعثت نبوی سے ۵، ۷ سال پہلے ہی مر گیا، اس کے بیٹے سعید بن زید ان دس صحابیوں میں سے ہیں جنھیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی، اور جنھیں "عشرہ مبشرہ" کہا جاتا ہے۔

ابن سلام الجمحی نے اسے طائف کے شعرا میں شمار کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس کے کلام
میں ایسی بہت سی عجیب و غریب باتیں ملتی ہیں جو اس سے پہلے کسی شاعر کے یہاں نہیں
ملتیں، جیسے زمین و آسمان کی پیدائش، ملائکہ، مرنے کے بعد حشر، جنت و دوزخ وغیرہ
کا تصور، اس نے تورات وغیرہ کے مطالعہ سے پچھلی قوموں کے بہت سے واقعات کا علم
حاصل کیا تھا، اور ان کو اپنے کلام میں اپنے خاص رنگ میں بیان کرتا تھا، چنانچہ اس کے
کلام میں سدوم کے کھنڈرات اور حضرت ابراہیم و اسحاق علیہما السلام کے واقعات بھی
ملتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ امیہ فطرۃً حق پسند و حق جو تھا، چنانچہ جب اس نے گوش و ہوش
کی آنکھیں کھولیں اور کائنات اور اس کا نظام اور زندگی اور اس کی بوقلمونی دیکھی
تو اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے، کون کر رہا ہے اور
اس کا مقصد اور حاصل کیا ہے، اس نے اس کا جواب مختلف مذاہب میں تلاش کیا،
اہل کتاب کے علماء سے پوچھا اور سمجھنے کی کوشش کی، مذہب عیسوی اور یہودیت کا
مطالعہ کیا اور یہودیوں اور عیسائیوں کے بہت سے قصوں اور اسفار کی روایت بھی کی،
ملت ابراہیمی اور سنت اسماعیلی کا حال جو کچھ اس زمانے کے بڑے بوڑھوں کو یاد تھا، ان سے
معلوم کیا، پھر اپنی سمجھ بوجھ، غور و فکر اور مطالعہ و تحقیق کی روشنی میں سوالات کے جواب
تلاش کیے اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس آسمان اور زمین کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے،
یہ نظام کائنات یوں ہی اپنے آپ نہیں چل رہا ہے، بلکہ اس کے پیچھے ایک کارساز کا
ہاتھ کارفرما ہے۔ اس نے نظام کائنات اور زمین پر انسانوں کے رہنے کے لیے ایک
ضابطۂ حیات بخشا ہے جس کے ذریعہ انسان نے ایک صالح اور پاک زندگی بسر
کرنے کے اصول بنائے ہیں تاکہ جس طرح نظام کائنات بغیر کسی رکاوٹ اور اکھاڑ پچھاڑ

کے سکون اور اطمینان کے ساتھ چل رہا ہے، انسانوں کی زندگی بھی سکون اور اطمینان
کے ساتھ چلتی رہے، اور اس مقصد کو حاصل کر سکے جس کی خاطر اس کی آفرینش ہوئی ہے
یہ اصول اور زندگی بسر کرنے کا یہ طریقہ انبیا اور رسل لے کر آئے، انھوں نے اس
کارساز کی نشاندہی کی اور لوگوں کو بتایا کہ وہ ایک ہے۔ اور مر کر ہر ایک کو اسکے
پاس جانا ہے۔ ان مسائل میں غور و فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ امیہ کی زندگی کا ڈھنگ بالکل
بدل گیا، اس نے کملی اوڑھنی شروع کر دی، بتوں کی کارفرمائی اور طاقت پر یقین نہیں رہا،
اور راگ و رنگ کی محفلوں سے دل اچاٹ ہو گیا، شراب و کباب اپنے اوپر حرام کر لیے
اور تلاش حق و حقیقت میں کھو گیا۔

تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ مختلف مذاہب کے مطالعے سے امیہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ
ایک نبی عنقریب پیدا ہونے والا ہے، اور اسے امید تھی کہ وہ نبی میں ہی ہوں گا، مگر
جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا، اور آپ کی
طرف سے اس کے دل میں حسد و کینہ بیٹھ گیا، چنانچہ اس نے نہ صرف آپ کا اور آپ کے
دین کا انکار کیا بلکہ اہل مکہ کو بھی آپ کی مخالفت پر ابھارنے لگا، اور غزوہ بدر میں
اس نے مقتولین قریش کا مرثیہ بھی کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان اشعار کی
خبر ہوئی تو آپ نے ان کی روایت کرنے اور پڑھنے سے منع فرما دیا، کہتے ہیں کہ یہ آیت
واتل علیہم نبأ الذی آتیناہ آیاتنا فانسلخ منها فاتبعه الشیطان فکان من
الغاوین۔ اسی کے بارے میں اتری تھی، یہ بھی روایت کیجاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
جب امیہ کے ایمان و یقین اور توحید و رسالت کے عقیدے سے معمور اشعار کو سنتے تھے تو
فرماتے تھے کہ "اسکی زبان تو ایمان لے آئی مگر اس کا دل منکر رہا"۔

مگر مختلف حالات پر غور کر لے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ امیہ آخر تک اپنے آپ کو نبی موعود سمجھتا رہا، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو وہ محض کینہ اور حسد کی وجہ سے اسلام نہیں لایا اور آپ کی مخالفت کرتا اور قریش کو بھی آپ کے خلاف ابھارتا رہا، میرے اس خیال کی بنیاد پر مفسرین کا وہ اختلاف ہے جو اس آیت سے مراد شخصیت کے بارے میں ملتا ہے، اور وہ عقلی اور نقلی دلائل ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آیت مذکورہ امیہ کے بارے میں نہیں بلکہ کسی اور شخصیت کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔

مفسرین نے اس آیت کی شان نزول کے سلسلہ میں اس سے متعلق مختلف نام بتائے ہیں، اُن میں سے ایک امیہ بن ابی الصلت کا نام بھی ہے، ان مفسرین نے اپنے خیال کی تائید میں چند روایتیں بھی نقل کی ہیں، جن کے راویوں میں بعض بہت اہم اور جلیل القدر شخصیتوں کا نام آتا ہے، جیسے حضرت عبد اللہ بن عمر اور سعید بن المسیب وغیرہ، مگر یہ بات قابل بحث ہے کہ ان جلیل القدر شخصیتوں کے بعد جو رواۃ ہیں وہ کس پائے کے ہیں، اور اس سلسلۂ روایت میں غیر ثقہ اور وضع سے متہم رواۃ تو نہیں شامل ہو گئے ہیں۔

مفسرین کرام نے اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں جس شخصیت کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے وہ بلعم بن باعورا ہے۔ اس کے بعد بعض نے امیہ بن ابی الصلت کا اور بعض نے ابو عامر راہب اور بعض نے اہل کتاب کے منافقین اور بعض نے بغیر نام بتائے "بنی اسرائیل کے ایک عالم" کا ذکر کیا ہے، اگر آپ ان ناموں پر غور کیجئے تو یہ دیکھکر حیرت ہوگی کہ ان میں سے کسی ایک میں بھی کوئی وجہ مشابہت نہیں ہے، نہ نسلی اعتبار

سے نہ وطنی، تہذیبی اور فکری و نظری لحاظ سے، چنانچہ ان میں سے ایک کنعانی ہے اور ایک عرب، ایک یہودی اور کچھ منافقین اہل کتاب جن سے مراد یہودی اور عیسائی دونوں ہو سکتے ہیں، کیونکہ دونوں اہل کتاب ہیں، جو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے، اور اگر ان شخصیتوں کے زمانے پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض کے درمیان سیکڑوں سال کا فرق ہے، چنانچہ ان ہی مفسرین کے قول کے مطابق بلعم بن باعورا حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں تھا، اور امیہ بن ابی الصلت آنحضورؐ کے عہد مبارک میں، اور ان دونوں پیغمبروں کے درمیان ہزاروں سال کا فرق ہے، اب سوال یہ ہے کہ ایسی انمل اور بے جوڑ شخصیتوں کو جنکے زمانے میں ہزاروں سال کا فرق ہے، کس طرح ایک ہی آیت سے متعلق کہا جا سکتا ہے، پھر جب ایک خاص واقعہ کی نسبت ان کی طرف کی گئی ہو؟

اس آیت کے امیہ بن ابی الصلت کے بارے میں نازل ہونے کا ذکر شاید پہلی مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر میں ملتا ہے، چنانچہ آپ سے اس آیت کی تفسیر مروی ہے کہ "آیاتنا" سے مراد الاسم الاعظم ہے، اس کے بعد ہے کہ "انسلخ" "ای خرج منہا" و ہو بلعم بن باعورا (یعنی وہ ہماری نشانیوں سے نکل گیا اور وہ بلعم بن باعورا تھا)، اللہ تعالےٰ نے اسے اسم اعظم سے نوازا تھا، مگر جب اس نے اس کے ذریعہ حضرت موسیٰؑ کے لیے بد دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے (بلعم بن باعورا) اس کا (اسم اعظم) حفظ سلب کر لیا۔" ویقال امیہ بن الصلت اکرمہ اللہ تعالیٰ بعلم حسن و کلام حسن ولما لم یومن اخذ اللہ منہ۔" یعنی اور کہا جاتا ہے کہ ہماری نشانیوں سے جو نکلا اس سے مراد امیہ بن ابی الصلت ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اسے اچھے علم اور اچھے کلام سے عزت بخشی تھی مگر جب وہ ایمان نہیں لایا تو اللہ تعالےٰ

نے اس سے وہ علم اور کلام چھین لیا۔"[1]

امام فخرالدین رازیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "لوگوں نے سب سے پہلے یہ ذکر کیا ہے کہ یہ آیت بلعم بن باعوراء کے بارے میں نازل ہوئی تھی، کیونکہ اس نے حضرت موسیٰؑ اور آپ کی قوم کو بد دعا دی تھی، جس کی وجہ سے وہ (صحرائے سینا میں) مارے مارے پھرتے رہے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ان کی صحرانوردی کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ بلعم نے تم لوگوں کے لیے بد دعا کی ہے، اس پر حضرت موسیٰؑ بولے کہ اچھا تو اب آپ اس کے بارہ میں میری بد دعا قبول کر لیجیے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بد دعا قبول کر لی، اور بلعم سے علم و ایمان چھین لیا، یہ (علم و ایمان) اسم اعظم تھا، پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، سعید بن المسیب، زید بن اسلم اور ابو روق کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "یہ آیت امیہ بن ابی الصلت کے بارے میں نازل ہوئی تھی، اس نے کتابیں (یہودیوں اور عیسائیوں کی) پڑھ رکھی تھیں، اور جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک رسول بھیجنے والا ہے اور اسے امید تھی کہ وہ رسول میں خود ہوں گا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا تو اس کو آپ سے حسد پیدا ہو گیا، آپ پر ایمان نہیں لایا، اور کفر کی حالت میں مرا۔" آگے چل کر امام رازی لکھتے ہیں کہ "کہا گیا ہے کہ یہ آیت ابو عامر راہب کے بارے میں اتری تھی، جسے آنحضرتؐ نے فاسق کا نام دیا تھا، اور یہ بھی کہا ہے کہ اہل کتاب کے منافقین کے بارے میں اتری تھی، یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے تھے، الخ۔"[2]

قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر میں "بنی اسرائیل کے ایک عالم" اور امیہ بن ابی الصلت

[1] حاشیہ الدر المنثور للامام السیوطی ج ۳ ص ۱۴۰ [2] تفسیر کبیر، امام رازی ج ۴ ص ۴۹۳

کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے، اور کہا ہے کہ "فانہ (ای امیہ) کان قد قرأ الکتب۔ الخ" اس نے (امیہ) کتابیں پڑھی تھیں (یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتابیں) اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک نبی اس زمانہ میں بھیجنے والا ہے اور اسے امید تھی کہ وہ خود بھی نبی (موعود) ہوگا، مگر جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اسے آپ سے حسد پیدا ہو گیا اور آپ کا انکار کر بیٹھا، یا (اس آیۃ سے مراد) بلعم بن باعوراء ہے، جو کنعانیوں میں سے تھا، جسے اللہ تعالیٰ کی کتاب کا کچھ علم عطا کیا گیا تھا، مگر "انسلخ منہا" یعنی وہ اس سے نکل بھاگا، الخ۔ اس کے بعد بیضاوی نے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ امام رازی کے الفاظ ہی دہرائے ہیں۔[1]

علمائے متاخرین میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ترجمہ قرآن پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنی تفسیر میں اس آیت سے مراد بلعم بن باعوراء ہی کو لیا ہے۔

مفسرین کا اس آیت کی شان نزول اور اس سے متعلق شخصیت کے بارہ میں مذکورہ اختلاف سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا ذہن اس بارہ میں صاف نہیں ہے، پھر قرآن مجید "آیاتنا" (ہماری نشانیاں) بصیغہ جمع کہتا ہے، اس لیے اس جمع سے واحد یعنی اسم اعظم کیسے مراد لیا جا سکتا ہے، کیونکہ قرآن میں جہاں بھی "آیاتنا" کا لفظ استعمال ہوا ہے اسے جمع ہی (نشانیاں) مراد لیا گیا ہے، واحد کے لیے "آیاتنا" شاید ہی کہیں استعمال ہوا ہو، پھر یہ اسم اعظم بجائے خیر و برکت کا ذریعہ ہونے کے بد دعا کرنے کا وسیلہ کیسے بن گیا، یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر بلعم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم سے کون سی دشمنی پیدا ہو گئی تھی جس کی بنا پر اس نے ان کے حق میں بد دعا کی، پھر اللہ تعالیٰ نے

[1] تفسیر بیضاوی

نے اپنے ایک نبی کے حق میں اس سے کم رتبہ شخص کی بددعا کیسے قبول کر لی، انبیا کی تاریخ میں اس کی مثال شاید ہی ملے کہ کسی شخص کی بددعا کی وجہ سے اللہ نے اپنے کسی نبی کو کسی آزمائش میں مبتلا کیا ہو، کلام مجید میں مختلف مواقع پر اس کی صراحت ہے کہ بنی اسرائیل کے صحرائے سینا میں مارے مارے پھرنے کا سبب انکی مسلسل نافرمانی، حکم عدولی اور گناہوں پر ان کا اصرار تھا، نہ کہ کسی کی بددعا کا اثر، اور اس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اچھا اب میری بددعا قبول کر لیجئے تو بن لے بغیر کسی جرم وگناہ کے بلعم سے نہ صرف اس کا علم چھین لیا بلکہ یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ وہ گمراہوں میں ہو گیا، جہاں تک اس آیت کے امیہ بن ابی الصلت سے متعلق ہونے کا سوال ہے تو اس کے بارے میں ان ہی مفسرین کا قول ہے کہ اسے کتابوں کا علم تھا اور ان کے ذریعہ سے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کا علم ہو گیا تھا، اب سوال یہ ہے کہ کیا قرآن مجید نے امیہ کے مبہم اور غامض علم اور شعر و شاعری میں اس کی قدرت کو "آیات" سے تعبیر کیا ہے، اور کیا از روئے لغت و ت اس قسم کے علم کو "اللہ کی نشانیاں" کہا جا سکتا ہے، اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے،[1] قرآن کریم نے مختلف مواقع پر اپنے انبیاء کے لیے کہا ہے کہ ہم نے انھیں اپنی نشانیاں دیں تاکہ وہ اپنے مخالفوں کے سامنے انھیں پیش

[1] امام راغب اصفہانی نے "مفردات القرآن" میں "آیۃ" کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "الآیۃ ہی العلامۃ الظاہرۃ وحقیقۃ لکل شیٔ ظاہر شیٔ لایظہر ظہورہ فمتی ادرک المدرک الظاہر علم انہ ادرک الآخر الذی لم یدرکہ بذاتہ، اذ کان حکمہا سواء وذالک ظاہر فی المحسوسات والمعقولات، وتولہ ان فی ذلک لآیات للمؤمنین" فہی من الآیات المعقولۃ التی تتفاوت بہا المعرفۃ بحسب تفاوت منازل الناس فی العلم"۔ ص ۳۲ مادۃ (ای)۔

کر کے اپنے دعویٰ کی صداقت ثابت کر سکیں، ایسے مواقع پر یہ نشانیاں محسوسات و معقولات دونوں قبیل کی ہیں، جیسے حضرت موسیٰؑ کا ید بیضا اور عصا اور حضرت عیسیٰؑ کا مردوں کو زندہ کر دینا، حضرت سلیمانؑ کی جن و انس اور چرند و پرند پر قدرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزۂ شق القمر وغیرہ، اور اس پر سارے تذکرہ نگار متفق ہیں کہ اس قسم کی کوئی نشانی امیہ کو نہیں ملی تھی، رہ گیا شعر و شاعری یا ظن و تخمین کے ذریعہ بعض آئندہ کی باتوں کا جان لینا تو اس قسم کے علم کو از روئے لغت "آیۃ" نہیں کہہ سکتے کہ آیۃ العلامۃ الظاہرۃ الخ بہر حال نہیں ہے، دوسرے موقعوں پر "آیاتنا" کا استعمال قرآن مجید میں عبرت و موعظت کے لیے ہوا ہے، جو بہر حال یہاں منطبق نہیں ہوتا، اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ امیہ کو معروف اور مفہوم معنوں میں "آیات" نہیں ملی تھیں، اور جب آیات نہیں ملی تھیں تو وہ مذکورہ آیت کا مخاطب اور اس سے مراد بھی نہیں ہو سکتا،

ابن سلام جمحی نے سفیان اور ابن داب سے روایت کی ہے کہ "امیہ ایک دفعہ زید بن عمرو بن نوفل سے ملا جو زمانۂ جاہلیت میں ورقہ بن نوفل کے ساتھ طلب حق میں مشغول رہتا تھا، اور اس سے پوچھا کہ "اے خیر کے متلاشی کیا تجھے وہ ملا"۔ زید نے جواب دیا کہ نہیں، میں جس چیز کی تلاش میں تھا وہ اب تک مجھے نہیں ملی، اس پر امیہ نے کہا کہ "الا انہ منا و منک او من اہل فلسطین"۔ یعنی وہ (نبی) یا تو ہم میں سے (عرب) ہوگا یا تم میں سے یا پھر اہل فلسطین میں سے"۔[1]

اس روایت میں لفظ "منا" سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ

[1] طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی ص ۲۲۰

اس کا اندازہ تھا کہ ہماری قوم میں سے یا ہمارے خاندان میں سے کوئی نبی ہوگا، اگر اس کو اپنے متعلق یقین ہوتا تو "منا" کہنے کے بجائے اس کی تصریح کر دیتا، جہانتک "منا" یعنی عربوں کا سوال ہے تو اس کا اندازہ بالکل صحیح نکلا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریشی تھے، اور قریش کا سلسلۂ نسب اوپر جاکر قبیلۂ مضر سے مل جاتا ہے، اور اس مضر کی ایک شاخ قیس عیلان تھی جس سے قبیلہ باہلہ اور ہوازن پیدا ہوئے، اور ہوازن سے امیہ کا قبیلہ ثقیف تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جب امیہ کی پیشین گوئی صحیح نکلی اور وہ متلاشی حق بھی تھا تو پھر وہ کیوں اپنے کو نبوت کا امیدوار سمجھتا اور اگر سمجھتا تھا تو اسے دعوی نبوت میں کونسی چیز مانع تھی؟ لوگ اس کو متقی، پرہیزگار اور جویائے حق وصداقت سمجھتے ہی تھے، گویا ذہنی طور سے اس کی نبوت کی تصدیق کے لیے تیار تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل مکہ کو اس نئے دین کی وجہ سے کد پیدا ہو گئی تھی، اس سے بھی امیہ کے دعوی نبوت کو قبول کرنے کے لیے پوری طرح فضا ہموار تھی، اب اگر اس نے اس کا دعوی نہیں کیا اور حق جانتے ہوئے بھی اس سے روگرداں رہا، اور حسد کی وجہ سے قریش کو آپ کی مخالفت پر ابھارتا رہا تو وہ منافق تھا، اور یہ الزام اس پر کسی تذکرہ نگار نے نہیں لگایا ہے، پھر اس کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ دین ابراہیمی کو مانتا تھا، اس کی مدح وتوصیف کرتا تھا، اور یہ خود اس کو اور سارے عرب کو معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنیادی طور سے دین ابراہیمی ہی تھا، اور جب رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین دین ابراہیمی تھا جس کی تلاش میں امیہ نے پوری عمر صرف کر دی تھی، تو اس کے آنے کے بعد اس سے انکار کیوں کرتا، اور اس دین کے

حامل سے حسد کیوں کرتا؟

حقیقت یہ ہے کہ امیہ بن ابی الصلت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی سچی اور صحیح خبر پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی، اور جب آپ نے دعوی نبوت کیا ہے تو امیہ ذہنی طور پر اس کو سننے کے لیے تیار تھا،

اس کے بارہ میں اغانی نے دو روایتیں نقل کی ہیں، ایک میں ہے کہ امیہ قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ باہر گیا ہوا تھا، ایک منزل پر امیہ ایک کنیسہ میں گیا، جہاں ایک پیر مرد بزرگ ملے، انھوں نے امیہ سے پوچھا کہ "تمھارے پاس آنے والا کس سمت سے آتا ہے؟" امیہ نے جواب دیا بائیں طرف سے، پھر اس نے پوچھا کہ وہ تم کو کس رنگ کے کپڑے پہننے کا حکم دیتا ہے، امیہ نے کہا کہ کالے رنگ کے کپڑوں کا، اس پر اس بزرگ نے کہا کہ "یہ ایک الجن ہے، قریب تھا کہ تم عربوں کے نبی ہو جاتے مگر اب ایسا نہیں ہوگا، یہ آنے والا داہنے طرف سے آئیگا اور اس کا پسندیدہ کپڑا سفید رنگ کا ہوگا"۔

دوسری روایت میں قافلہ کے شام جانے کا ذکر ہے، یہاں بھی ایک منزل پر امیہ ایک کنیسہ میں جاتا ہے، اور وہاں ایک عالم راہب اس سے اس قسم کے سوالات کرنے کے بعد یہی فیصلہ دیتا ہے کہ تم نبی موعود نہیں ہو، بلکہ نبی موعود دوسرا ہے، جو پیدا ہو چکا ہے،[1]

ان روایتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امیہ کو آپ کی بعثت سے بہت پہلے یقینی خبر مل چکی تھی کہ نبی وہ نہیں ہوگا، بلکہ دوسرا عرب ہوگا، اور جو پیدا بھی ہو چکا ہے،

---

[1] الاغانی - ابو الفرج الاصفہانی ج ۳ ص ۱۸۸

اس علم کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ اپنے آپ کو نبی موعود کیوں سمجھتا، درحقیقت اس کا یہی علم تھا جس کی وجہ سے اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، ورنہ دوسرے قرائن اور حالات ایسے تھے کہ اگر وہ نبوت کا دعویٰ کر دیتا تو اسے شاید زیادہ مایوسی نہ ہوتی، اور اس کے اوصاف کی بنا پر اسکی تصدیق کرنے والے مل جاتے۔

رہی یہ روایت کہ امیہ نے مقتولین بدر کا مرثیہ کہا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس کی روایت کرنے اور پڑھنے سے منع فرما دیا تھا، کیونکہ "اس کی زبان مومن تھی لیکن دل کافر رہا"، تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایسے بہت سے لوگ تھے، جو باوجود اسلام کو حق سمجھنے کے مسلمان نہیں ہوئے، ان اشخاص میں بعض آپ کے قریب ترین اعزہ بھی تھے، جنھوں نے ہر موقع پر تاحیات آپکا ساتھ دیا، آپ کی خاطر تکلیفیں اٹھائیں، اہل مکہ کی مخالفت مول لی، اور سماجی بائیکاٹ کی سختیاں جھیلیں، اور جو اپنی فہم و فراست میں سارے عرب میں مشہور، اور شرافت و دیانت داری میں ضرب المثل تھے، مگر وہ ایمان نہیں لائے، اس کی وجہ حسد نہیں، بلکہ جاہلی عزت نفس یعنی قبائل عرب میں خیالی بے عزتی کا خیال اور اپنے پرانے طور طریقوں کو چھوڑنے پر انگشت نمائی کا خوف تھا، اس کے باوجود ان میں سے کسی کے بارے میں کوئی آیت نہ اتری، حالانکہ علم و یقین کے بعد "انسلاخ" کا اطلاق ان لوگوں پر پوری طرح صحیح تھا،

اب ذرا قرآن مجید کی مذکورہ آیت پر امیہ کو سامنے رکھ کر غور کیجئے، قرآن کہتا ہے کہ واتل علیھم نبا الذی آتیناہ آیاتنا فانسلخ منھا الخ "یعنی آپ ان یہودیوں کو اس شخص کی خبر (قصہ) سنا دیجئے جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں"، اس انداز بیان

سے پتہ چلتا ہے کہ جسے نشانیاں دی گئی تھیں وہ کوئی بہت اہم شخصیت کا مالک تھا، اور نشانیاں محسوس و معقول تھیں، پھر اس شخص سے کوئی بہت اہم "نبا" متعلق تھی، اب سوال یہ ہے کہ کیا امیہ کی شخصیت اتنی اہم تھی کہ اس سے قرآن کے بلیغانہ انداز میں کوئی "نبا" متعلق ہو، اور کیا اسے ایسی ظاہری نشانیاں دی گئی تھیں جو محسوس بھی ہوں، اور عقل میں آجائیں؟ قرآن میں جہاں کہیں "نبا" کا ذکر آیا ہے وہ بہت ہی اہم مواقع ہیں، اور امیہ کی شخصیت یا اس کا اسلام لانا اتنا بڑا واقعہ نہیں ہے کہ اسے قرآن "نبا" کا مقام دیتا، اور نہ علم و عقل رکھنے کے باوجود اس کا ایمان نہ لانا اتنا بڑا حادثہ ہے کہ اسے "نبا" کہا جا سکے[1] کیونکہ اس "نبا" سے کوئی ایسا علم نہ حاصل ہوتا جو بہت اہم اور بہت مفید ہوتا حقیقت جان لینے کے بعد بھی ایمان نہ لانے کے واقعات بے شمار پیش آتے رہتے تھے، ابوجہل ہمیشہ آپ سے کہتا تھا کہ محمد میں تم کو جھوٹا نہیں سمجھتا، پھر بھی ایمان نہیں لایا[2]، اور حالت کفر میں قتل ہوا، یہاں بھی ایمان نہ لانے کی وجہ نخوت، سبکی کا خیال اور قبائلی تعصب تھا، آخر اعشیٰ بھی جو متفقہ طور سے امیہ کے مقابلہ میں بڑا شاعر تھا، صرف چند اونٹوں کی خاطر ایمان نہ لایا، حالانکہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھا تھا اور ایمان لانے کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر بھی ہوا تھا، مگر آخر کار کفر کی حالت میں مرا، قرآن نے اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے، حالانکہ عبرت و موعظت کے اعتبار سے اس واقعہ میں بڑی جان ہے، کیونکہ

---

[1] "نبا" کی تشریح کرتے ہوئے امام موصوف نے لکھا ہے کہ "النبا" خبر ذو فائدۃ عظیمۃ یحصل بہ علم او غلبۃ ظن، ولا یقال للخبر فی الاصل نبا حتی یتضمن ہذہ الاشیاء الثلاثۃ وحق الخبر الذی یقال فیہ "نبا" ان یتعری عن الکذب۔ کالتواتر وخبر اللہ تعالیٰ وخبر النبی علیہ السلام۔ مفردات القرآن۔ مادہ (ص ۴۹۹)

[2] سیرۃ النبی۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ بحوالہ سیرۃ ابن ہشام

اگر اعشیٰ جیسا شاعر ایمان لے آتا تو اس سے اسلام کو بہت تقویت پہنچتی، اس لیے کہ
اعشیٰ اتنا قادر الکلام، نامور اور ممتاز شاعر تھا کہ اپنے کلام سے جسے چاہتا گرا دیتا،
اور جسے چاہتا مدح کے ذریعے اٹھا دیتا تھا۔ اس سلسلہ میں محلق کی ان لڑکیوں کی طرف
اشارہ کرنا مناسب ہے، جن کی شادی محلق کی غربت، گمنامی اور قبائل عرب میں بے حیثیت
ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتی تھی، مگر جب اعشیٰ نے محلق کی تعریف میں اپنا قصیدہ عکاظ کے
میلے میں پڑھا تو سال بھر بھی نہ گزرنے پایا کہ اس کی آٹھوں لڑکیاں امیروں، رئیسوں
کے محلوں کی زینت بن گئیں، اسی خطرہ کے پیش نظر اہل مکہ نے اسے یہ کہکر واپس کر دیا تھا
کہ اس سال رک جاؤ، اگر محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہم پر غالب آجاتے ہیں تو تم اسلام
لے آنا، اسلیے اسکے اسلام نہ لانے کا واقعہ بیشک عبرت اور موعظت کے خیال سے قابل ذکر
تھا کہ اس کا انجام کتنا دردناک ہوا۔ مکہ سے واپس جاتے ہوئے اونٹنی سے گر گیا
اور چوٹ کے صدمہ سے مرگیا۔[1] مگر قرآن نے اتنے اہم واقعہ کا ذکر بھی مناسب نہیں سمجھا،

اب رہی امیہ کو کسی خارق عادت، عمل یا خدا کی طرف سے "آیات" ملنے کا سوال
تو اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے، کیونکہ امیہ کو پورے جزیرۂ عرب میں کیا شعرائے جاہلیت
میں بھی کوئی بہت نمایاں حیثیت حاصل نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ تذکرہ نگاروں نے اس کا
ذکر "فحول الشعراء" میں نہیں کیا ہے، اس سے کہیں اہم شخصیت تو قس بن ساعدۃ الایادی
اور ورقہ بن نوفل کی تھی، جو امیہ کی طرح خود بھی حق و حقیقت کے متلاشی تھے، اور اس
آرزو میں دنیا سے رخصت ہوگئے،

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ امیہ کی نہ تو شخصیت اتنی

[1] اس کی تفصیل اعشیٰ کے حالات زندگی میں ملاحظہ کیجئے۔

بڑی تھی اور نہ اس کی ذات میں کوئی ایسی غیر معمولی امتیازی شان تھی کہ اسے یہ درجہ
حاصل ہوتا کہ قرآن اس کے ایمان نہ لانے کے واقعہ کو اتنی اہمیت دیتا، اور اس کو "نبا"
کہہ کر پکارتا، یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت کا تعلق بہر حال امیہ سے
نہیں ہے، ممکن ہے بقول مفسرین و رواۃ اس کا تعلق بلعم بن باعورا یا کسی دوسرے شخص
سے ہو، جس میں پڑنے اور اس کی تحقیق کرنے کا یہاں موقع نہیں،

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ سیرت نگاروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے تمام مخالفین اور دشمنوں کی ایک فہرست اپنی کتابوں میں دی ہے، لیکن
باوجود چھان بین کے اس فہرست میں امیہ بن ابی الصلت کا نام کہیں نہیں ملتا،
اگر یہ صحیح ہے کہ وہ قریش کو آپ کی مخالفت پر اکساتا تھا، تو اس کا نام کسی نہ کسی سلسلہ
میں ضرور آتا، اس سے بھی اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ مذکورہ آیت کے شان نزول
کے سلسلہ میں جو باتیں امیہ سے منسوب کی گئی ہیں، وہ شاید یقین کو نہیں پہنچتیں،

اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کی روایتیں آخر کیسے گئیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ
بہت سی روایات جن کی بنیاد کسی ثقہ سند پر نہیں ہے، تفسیروں میں رواج پا گئی ہیں،
اور چونکہ ان کا تعلق اسلام کے بنیادی عقائد، اس کی تعلیمات اور عبادات سے نہیں
ہے، اس لیے ہمارے علماء نے ان کو نقل کرنے میں کوئی ہرج نہیں محسوس کیا، اور
بغیر تحقیق کے ان کو جوں کا توں رہنے دیا، اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ قبائلی عصبیت
کی وجہ سے اس قسم کی روایتیں بعد میں وضع کر کے انھیں مشہور کر دیا گیا ہو کہ قبیلہ کے
اس فرد کی اہمیت کے ساتھ خود قبیلہ کی اہمیت بھی اجاگر ہو جائے گی، اس مقصد
کی خاطر خاص طور سے بنی عباس کے عہد میں بہت سی ادبی روایتوں کو گڑھا گیا،

ان میں ان روایات کو بڑی اہمیت دیجاتی تھی، جو شعراء و ادباء کی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے وضع کی جاتی تھیں،[1]

امیہ بن ابی الصلت ثقفی تھا، بنو ثقیف نے زمانۂ جاہلیت اور عہد اسلام دونوں زمانوں میں ایسے عظیم الشان کارنامے انجام نہیں دیے تھے، جن کی بنیاد پر وہ قبیلوں کے درمیان مفاخرت میں کوئی اونچا مقام حاصل کر سکتا، اس لیے عین ممکن ہے کہ اس قبیلہ کے افراد نے اپنے قبیلہ کے شاعر اور فلسفی کی اہمیت بڑھانے کے خیال سے اس قسم کے خیالات کو شہرت دی ہو، اور اس طرح اپنے قبیلہ کی اہمیت کو اجاگر کرنا چاہا ہو کہ قرآن مجید میں جس شخص کا ذکر اس انداز سے آجائے تو اسکی اور اس کے ساتھ اس قبیلہ کی اہمیت و عظمت سامنے آجائے گی، مگر جیسا کہ پہلے بیان ہوا، امیہ کی شخصیت ہرگز ایسی نہیں ہے کہ قرآن کریم اس کو یہ حیثیت اور اتنی اہمیت دیتا،

اس رائے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ قدیم تذکرہ نگاروں میں سے صاحب نظر ادباء اور نقادوں نے اس آیت کا ذکر نہیں کیا ہے، جیسے ابن سلام الجمحی نے، جاحظ اور ثعالبی وغیرہ، ابن سلام الجمحی نے امیہ کا وہ شعر ضرور نقل کیا ہے جو اس نے مقتولین بدر کے مرثیہ میں کہا ہے، مگر اس کے علاوہ اور کوئی شعر اس کا ذکر نہیں کیا ہے، البتہ ابوالفرج اصفہانی نے اپنی کتاب الاغانی میں اس آیت اور اس کی شان نزول کے طور پر امیہ کا مذکورۂ بالا واقعہ نقل کیا ہے، لیکن اصفہانی کی روایت پر پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ وہ رطب و یابس ہر قسم کی روایات جمع کر دیتا ہے، وہ نہ تو سیرت کی مستند کتاب ہے اور نہ تاریخ کی، اور اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ

[1] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: ڈاکٹر طہ حسین کی کتاب: فی الادب الجاہلی۔

اغانی کی بہت سی روایات اور قصے محض من گھڑت اور جھوٹے ہیں، خود ابوالفرج نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ میں نے جو کچھ لوگوں کو کہتے سنا ہے بغیر تحقیق و تدقیق کے نقل کر دیا ہے،[1] عرب تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکرے عام طور سے اغانی کی روایات سے مرتب کیے ہیں، اس لیے بعد کے سب تذکرہ نگاروں نے بغیر تحقیق و تدقیق کے اغانی کے بیان کو نقل کر دیا اور اس کی مطلق پرواہ نہیں کی کہ قرائن اور عقل سلیم کی روشنی میں یہ باتیں کہاں تک صحیح ہیں، متاخرین میں اسکی ابتدا جرجی زیدان نے اپنی کتاب تاریخ آداب اللغۃ العربیہ میں کی، اور اس کی تقلید میں دوسرے مصنفین نے بھی ان باتوں کو جوں کا توں نقل کر دیا، اس کی وجہ سے یہ غلط فہمی بلکہ غلط بیانی آج تک ہماری عربی ادب کی تاریخ میں چلی آرہی ہے۔

اب رہا امیہ کا مقتولین بدر کا مرثیہ کہنا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، وہ شاعر تھا، مسلمان نہیں ہوا تھا، اہل مکہ سے اس کے تعلقات تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ بدر کی شکست اور اس میں اہل مکہ کی رسوائی قریش مکہ کی تاریخ کا سب سے دردناک اور ذلت آمیز المیہ تھا، اس لیے اگر اس واقعہ پر امیہ کو رنج ہوا اور یہ رنج شعر کی شکل میں ظاہر ہوا، تو اس میں کونسی تعجب کی بات ہے؟ عبادت اور ذکر و فکر عام طور سے دل میں رقت پیدا کر دیتا ہے، امیہ کی زندگی اسی میں گزری تھی، اس لیے وہ رقیق القلب تھا، اس نے شدت تاثر میں آنسو بہا دیے جو شعر میں ڈھل کر زبان زد خاص و عام ہو گئے،

امیہ بن ابی الصلت نے عبداللہ بن جدعان کی شان میں بڑے پرزور مدحیہ قصیدے

[1] اغانی کی روایات کے بارے میں ملاحظہ کیجئے: ڈاکٹر محمد احمد خلف اللہ کی کتاب "صاحب الاغانی ابوالفرج الاصفہانی الروایۃ"، اور علی العمیر کا مضمون، مع ابن الفرج الاصفہانی فی کتاب الاغانی، مطبوعہ مجلۃ العرب، الریاض، ماہ رجب ۱۳۸۹ھ، اکتوبر ۱۹۶۹ء

کے ہیں، عبد اللہ قرشی کا نامور سردار اور بہت ہی سخی داتا امیر تھا، کہتے ہیں کہ امیہ نے اس کی اس طرح مدح کی ہے جس طرح زہیر بن ابی سلمی ہرم بن سنان کی مدح کیا کرتا تھا۔

امیہ کی پیدائش طائف میں ہوئی تھی یہیں اس کے باپ نے جو خود بھی بہت بڑا شاعر تھا، اس کی تعلیم و تربیت کی، بڑے ہو کر اس نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا، شام اور یمن مال تجارت بیچنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ ان سفروں میں اس کی راہبوں اور پروہتوں سے ملاقاتیں ہو جاتی تھیں، اور وہ ان سے دین و ایمان کی باتیں کرتا تھا، جنھوں نے آگے چل کر اس کی زندگی کا نقشہ بدل دیا، مختلف ادیان کے مطالعہ نے اسے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ تمام ادیان باطل ہیں، صرف دین ابراہیمی صحیح ہے،

کل دین یوم القیامۃ عند اللہ، الا دین الحنیفۃ زور یعنی اللہ کے نزدیک قیامت کے دن تمام دین جھوٹے ثابت ہوں گے، سوائے دین حنیف (ابراہیمی) کے، اس دین ابراہیمی کی طرف اس طرح اشارہ کرتا ہے،

رب الحنیفۃ لم تنفد خزائنہ   مملوءۃ طبق الآفاق سلطانا

یعنی وہ دین حنیف کا مالک ہے، اس کے خزانے کبھی خالی نہیں ہوتے، ہمیشہ بھرے رہتے ہیں، اور جس نے اپنی بادشاہی اور کارفرمائی سے سارے آفاق کو گھیر رکھا ہے،

(باقی)

تہذیب کی تشکیل جدید

از جناب مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۳)

انسان و کائنات دونوں سے متعلق تعلیم ضروری ہے

پرورش کے بعد تعلیم بھی والدین کے ذمہ ہے، اس میں شک نہیں کہ مغرب نے کائنات سے متعلق علم میں کافی ترقی کر لی ہے، لیکن انسان سے متعلق علم میں ابھی بہت پیچھے ہے، چنانچہ کائنات کی گتھیاں سلجھانے میں کامیاب اور انسان کی گتھیاں سلجھانے میں بری طرح ناکام ہے "David.C.Marsh" نے اعتراف کیا ہے کہ

طبیعیات کے متعلق ہمارا علم بہت وسیع ہے، اور ہم نے پہلے کے مقابلہ میں فطری طاقتوں کے ایک بڑے حصہ کو اپنے قابو میں کر لیا ہے، لیکن ابھی ہم انسانی معاملات کے بیشمار پہلوؤں سے افسوسناک حد تک لاعلم ہیں۔[1]

اور "A. W. Haslet" نے کہا ہے:-

سائنسداں کسی بحث و مسئلہ میں اس سے زیادہ عاجز و درماندہ نہیں ہے جتنا خود انسان کے معاملہ میں، وہ ایٹم کو توڑ سکتا ہے، بعید ترین ستاروں کی تحلیل و تجزیہ کر سکتا ہے، بجلی کو غلام بنا سکتا ہے، لیکن یہی سائنسداں جب زندگی کی حقیقت بلکہ خود اپنی یا انسان کی حقیقت سمجھنا چاہتا ہے تو مشکلات ہی مشکلات

---

[1] David: C. Marsh. The changing social structure. England & Wales P.263

سے دوچار ہوتا ہے، نہ زندگی تابو یافتہ تجربہ کی متحمل ہے نہ انسان ہی۔[۵]

قرآن حکیم سے علوم قسم کی تعلیم کا ثبوت

تشکیل جدید میں انسان سے متعلق اس قدر علم موجود ہے کہ اس کے مسائل کے حل میں کوئی دشواری نہیں رہتی اور کائنات سے متعلق نہ صرف ہر مفید علم سے استفادہ کی تاکید ہے، بلکہ اس میں ارتقائی سلسلہ جاری رکھنا ضروری ہے، ورنہ قیام وبقا کی ضمانت نہ حاصل ہو سکے گی۔ چنانچہ قرآن حکیم کی ابتدا ہی پڑھنے کے حکم (لفظ اقرأ) سے ہوئی، جو آیتیں سب سے پہلے نازل ہوئیں ان میں یہ حقیقت ظاہر کی گئی کہ جس مادہ (جما ہوا خون جو نطفہ کے بعد کا درجہ ہے) سے انسان کی پیدائش ہوئی، اس اعتبار سے اگرچہ وہ کسی عزو شرف کا مستحق نہیں ہے، لیکن علم کی بدولت وہ ترقی کی ہر منزل پر پہنچ سکتا ہے۔

اقرأ باسم ربك الذی خلق	اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے پیدا
خلق الانسان من علق اقرأ	کیا، انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا!
وربك الاکرم الذی علم	کیا، آپ پڑھیے آپ کا رب نہایت کریم ہے
بالقلم علم الانسان مالم یعلم	جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا! انسان
(علق - ۱)	کو وہ سکھایا جو جانتا نہ تھا۔

اسی طرح انسان (آدم) کی پیدائش کے فوراً بعد فرشتوں سے امتحانی مقابلہ کے ذریعہ یہ حقیقت بتائی گئی کہ حکومت وقیادت محض علم کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ فرشتوں نے ان الفاظ میں اس کا اعتراف کیا،

---

[۵] A. W. Haslet unsolved Problems. P. 195

از مولانا عبدالباری مذہب وسائنس

سبحانك لاعلم لنا الا ما	آپ کی ذات پاک ہے، ہمارے پاس
علمتنا انك انت العلیم	وہی علم ہے جو آپ نے دیا ہے، بیشک
الحکیم (بقرہ : ۴)	آپ علم والے اور حکمت والے ہیں۔

طالوت کے واقعہ میں یہ واضح کر دیا گیا کہ حکومت وقیادت کی اہلیت مال و دولت اور خاندان ونسلی نذہب سے نہیں، بلکہ علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت سے حاصل ہوتی ہے، قرآن حکیم میں ہے:

وقال لهم نبیهم ان الله قد	ان کے نبی نے کہا اللہ نے تمہارے لیے
بعث لكم طالوت ملكا قالوا	طالوت کو حکمراں مقرر کیا ہے، انھوں نے
انی یكون له الملك علینا	کہا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کو ہم پر
ونحن احق بالملك منه ولم	حکمرانی مل جائے، حالانکہ اس سے زیادہ
یؤت سعة من المال قال ان	حکمراں ہونے کے ہم حقدار ہیں، نیز یہ کہ
الله اصطفه علیكم وزاده	اس کو مال و دولت کی وسعت نہیں
بسطة فی العلم والجسم	حاصل نہیں ہے، نبی نے یہ سنکر کہا اللہ نے
(بقرہ : ۳۲)	طالوت کو تم پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے
	اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں
	میں اسے وسعت دی ہے،

ہر دور میں قوت وطاقت کیلئے علم کا جو معیار ہو اس کی مطابقت ضروری ہے

بات صرف علم پر نہیں ختم ہوتی، بلکہ ہر دور کے لحاظ سے قوت و طاقت کے لیے علم کا جو معیار ہے، اس کے مطابق علم حاصل کرنا ضروری ہے، مثلاً یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے، اس میں حکومت وقیادت کے لیے

"پیمانہ" موجودہ معیار کے مطابق ہونا چاہیے،

قرآن حکیم میں لفظ "قوت" اور "الحدید" کا جس انداز سے تذکرہ ہے، اس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ قوت و طاقت کے سامان اور افادی صلاحیتوں میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا، جس کا ساتھ دیے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی،

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة (انفال - ۷)

حسب استطاعت قوت و طاقت کے سامان پیدا کر کے تیار رہو،

دوسری جگہ ہے:

وانزلنا الحديد فيه باس شديد ومنافع للناس (حدید - ۳)

اور ہم نے لوہا اتارا (نکالا) جس میں سخت سزا اور لوگوں کے لیے کثیر منافع ہیں۔

احادیث سے دونوں قسم کی تعلیم کا ثبوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انداز سے علم کی طرف توجہ دلائی مثلاً

بعثت معلما[1]

میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں

قلم (ذریعۂ علم) کے بارے میں فرمایا

ان اول ما خلق الله القلم[2]

اللہ نے پہلے قلم کو پیدا کیا،

علم کا خاصہ ترقی و سربلندی بیان کیا،

ان الحكمة تزيد الشريف شرفا وترفع المملوك حتى تجلسه مجالس الملوك[3]

بیشک حکمت شریف کی شرافت میں اضافہ کرتی اور پست لوگوں کو ترقی دیکر بادشاہ کی مجلسوں میں بٹھاتی ہے۔

---

[1] ابن عبدالبر: جامع بیان العلم ج ۱ و مشکوۃ کتاب العلم الفصل الثالث [2] مشکوۃ باب الایمان بالقدر الفصل الثالث
[3] جامع بیان العلم ج ۱ باب لا حسد الا فی اثنتین

علم کو قوموں کی قیادت اور ان کے نقش قدم کی اتباع کا سبب قرار دیا،

السلاح على الاعداء والزين عند الاخلاء يرفع الله به اقواما فيجعلهم في الخير قادة وائمة تقتص آثارهم ويقتدى بافعالهم وينتهى الى رأيهم[1]

علم دشمن کے مقابلہ کے لیے ہتھیار اور دوست کے لیے زینت ہے، اللہ اسکے ذریعہ قوموں کا درجہ بلند کرتا اور انکو قائد و پیشوا بناتا ہے، جن کے نقش قدم اور کام کی اتباع کی جاتی، نیز انکی رائے آخری تسلیم کیجاتی ہے،

علم کا دائرہ نہایت وسیع کیا اور کسی ایک (دینی یا دنیوی) دائرہ میں اس کو محدود نہیں رکھا،

الكلمة الحكمة ضالة الحكيم فحيث وجدها فهو احق بها[2]

حکمت و دانائی کی بات حکیم کی گمشدہ پونجی ہے جہاں بھی وہ ملے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے

رسول اللہؐ نے ہر مفید علم کے لیے دور دراز سفر کرنے کی تاکید کی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مفید علم حاصل کرنے کیلیے دور دراز سفر کی تاکید کی اور اس راہ میں کسی قسم کا تعصب گوارا نہ کیا،

اطلبوا العلم ولو بالصين[3]

علم حاصل کرو اگرچہ چین میں ملے،

اس حدیث کو سند کے لحاظ سے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے،[4] لیکن اس کا مفہوم خلاف قیاس نہیں ہے، کیونکہ عرب اور چین کے درمیان بعد المشرقین ہے، مگر عرب کی بندرگاہوں میں چینی جہازوں کی آمد و رفت رہتی تھی، اور بعض شہروں

---

[1] ابن عبدالبر: جامع بیان العلم باب جامع فی فضل العلم [2] ترمذی ابن ماجہ و مشکوۃ کتاب العلم [3] ابن عبد البر: جامع العلم باب طلب العلم فریضة علی کل مسلم [4] بیہقی: مدخل

میں چینی مال فروخت ہوتا تھا، مسعودی نے لکھا ہے:

ان مراکب الصین کانت تاتی	چینی جہاز عمان، سیراف، فارس
بلاد عمان وسیراف وساحل	اور بحرین کے شہروں اور بندرگاہوں
فارس وساحل البحرین الخ[1]	میں آتے تھے،

دبا (عمان میں) کے بارے میں ابن حبیب نے لکھا ہے،

ثم سوق دبا وھی فرضۃ العرب	"دبا" ایک بندرگاہ تھی، رجب کے
یاتیھا تجار السند والھند والصین	آخری دن وہاں بڑا بازار لگتا تھا
واھل المشرق والمغرب	جس میں سندھ، ہندوستان،
فیقوم سوقھا آخر یوم من	چین اور مشرق و مغرب کے تاجر
رجب[2]	آتے تھے،

رسول اللہؐ نے اپنے زمانہ کے اہم ترین اسلحے استعمال کیے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اہم ترین آلات حرب یہ تھے: دبابہ، یہ خاص قسم کی گاڑی تھی، جو تیر سے حفاظت کے لیے موٹا چمڑا منڈھ کر بنائی جاتی اور قلعہ شکنی کے لیے استعمال کی جاتی تھی[3]،

ضبر۔ لکڑی پر کھال منڈھ کر چھتری کی طرح بنائی جاتی جس کے ذریعہ بیٹھ کی تیر سے حفاظت ہوتی تھی[4]،

منجنیق، یہ جنگی ہتھیار تھا جس کے ذریعہ وزنی پتھر دشمنوں پر برسائے جاتے تھے[5]،

حسک۔ یہ ایک خاردار گھاس (گوکھرو) کی شکل کا ہتھیار جس کو قلعہ اور لشکر

[1] مسعودی: مروج الذہب ومعادن الجوہر الباب الخامس عشر ذکر ملوک الصین والترک و تفرق ص ۳۰۸
[2] ابن حبیب المحبر اسواق العرب المشہورۃ فی الجاہلیۃ ومبایعتہم فیہا [3] ابوالقاسم عبدالرحمن السہیلی الروض الانف شرح سیرۃ النبویہ لابن ہشام فصل ذکر تعلم اہل الطائف [4] ایضاً [5] لسان العرب

کے چاروں طرف بکھیر کر راستہ کو مخدوش کیا جاتا تھا[1]،

منجنیق سب سے پہلے اللہ کے رسول نے چلائی اور حسک آپ نے بکھیری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو برآمد کرکے غزوہ طائف میں استعمال فرمایا[2]، بلکہ منجنیق سب سے پہلے خود آپ نے چلائی اور حسک آپ نے بکھیری، ابن ہشام کا بیان ہے

حدثنی من اثق بہ ان رسول اللہ	جس شخص پر میں اعتماد کرتا ہوں اس نے
اول من رمی فی الاسلام	یہ مجھ سے بیان کیا کہ اسلام میں سب سے
بالمنجنیق رمی اھل الطائف[3]	پہلے طائف والوں پر رسول اللہؐ نے منجنیق چلائی،

مقریزی کہتے ہیں:

ونصب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کے
المنجنیق علی حصن الطائف[4]	قلعہ پر منجنیق نصب کی،

دوسری جگہ ہے

ونثر رسول اللہ الحسک حول الحصن[5]	رسول اللہ نے قلعہ کے گرد حسک بکھیری

جس منجنیق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال کیا تھا، اس کے بارے میں مختلف قول ہیں، بعض کے نزدیک وہ باہر سے منگایا گیا تھا، اور بعض کے نزدیک حضرت سلمان فارسیؓ نے اس کو بنایا تھا[6]،

طائف فتح ہونے کے بعد سنہ ۹ھ میں عروہ بن مسعود ثقفی اور غیلان بن سلمہ ثقفی نے اسلام قبول کیا، اور جرش جاکر مذکورہ ایجادات میں مہارت حاصل کی تھی،

[1] القاموس المحیط [2] تقی الدین احمد بن علی مقریزی: امتاع الاسماع حصن الطائف [3] ابن ہشام: السیرۃ النبویہ ذکر غزوۃ الطائف [4] امتاع الاسماع حصن الطائف [5] ایضاً ص ۴۱۸ [6] ایضاً

لم یشھد حنینا ولا حصار الطائف عروۃ بن مسعود ولا غیلان بن سلمۃ کانا بجرش یتعلمان صنعۃ الدبابات والمجانیق والضبور[1]

عروہ بن مسعود ثقفی اور غیلان بن سلمہ ثقفی حنین اور طائف کے محاصرہ میں موجود نہ تھے، یہ دبابہ منجنیق اور ضبر کی صنعت سیکھنے جرش گئے تھے،

جرش میں ہتھیار سازی کا کارخانہ تھا جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتح ہوا

"جرش" دمشق کے مضافات میں ایک شہر تھا، جو اُس وقت کی دوسری بڑی طاقت روم کے قبضہ میں تھا، اس میں ہتھیاروں کا بڑا کارخانہ تھا، شرجبیل بن حسنہ نے حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں اس کو فتح کیا تھا،

وکانت اذذاک فی ید الروم وفتحھا شرجبیل بن حسنہ فی زمان عمر بن الخطاب[2]

اس وقت "روم" کے قبضہ میں تھا حضرت عمرؓ کے زمانہ میں شرجبیل نے اس کو فتح کیا تھا،

رسول اللہؐ نے ہتھیار سازی کے علم میں بھی ترقی کرتے رہنے کیطرف توجہ دلائی

جرش فتح ہونے کے بعد ہتھیار سازی کا کارخانہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا تو انھوں نے اس کو اور ترقی دی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مختلف انداز میں فنون حرب سیکھنے کی ترغیب دلاتے تھے، ایک موقع پر فرمایا:

من علم الرمی ثم ترکہ فلیس منا[3]

جس نے تیراندازی سیکھی، پھر اس نے چھوڑ دیا، وہ ہم میں سے نہیں

---

[1] ابن ہشام السیرۃ النبویۃ ج ۳ ذکر غزوۃ الطائف بعد حنین فی سنۃ ثمان والروض الانف فصل ذکر تعلم اہل الطائف [2] ج ۳ [3] مسلم ومشکوۃ باب اعداد آلۃ الجہاد [4] امتاع الاسماع نزل رسول اللہ بالوح حاشیہ ۱۳۶۲

دوسری جگہ ہے

ان اللہ یدخل بالسھم الواحد ثلثۃ نفر الجنۃ صانعہ یحتسب فی صنعتہ الخیر والرامی بہ ومنبلہ[1]

اللہ ایک تیر کے ذریعہ تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرتا ہے، بنانے والا جو طالب ثواب ہو، چلانے والا اور اٹھا کر دینے والا۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ تعلیم کا دائرہ کسی ایک گوشہ میں محدود نہیں ہے، بلکہ انسانی ضرورت کے تمام گوشوں پر حاوی ہے،

شخصیت سازی کی طرف خاص توجہ کرنے کا حکم

تعلیم کے ساتھ شخصیت سازی کی طرف بھی خاص توجہ کرنے کا حکم ہے جس کے مخاطب اصلاً والدین و اساتذہ ہیں، مغربی تہذیب میں اس کے لیے کوئی معیار مقرر نہیں ہے، لیکن تشکیل جدید میں "معیار" اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، یہ صفات جس طرح جمالی ہیں، اسی طرح جلالی اور کمالی بھی ہیں، ان کے عکس سے جو صفات نمودار ہوتی ہیں، ان کی تفصیل اوپر گذر چکی، ایک متوازن شخصیت کے لیے تناسب کے ساتھ ان سب کی نمود ضروری ہے، فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے تو ان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے، لیکن بالقصد کسی پہلو پر زیادہ زور دینے اور کسی کو بالکلیہ نظرانداز کرنے کی گنجایش نہیں ہے،

اس میں مشرق و مغرب دونوں ناکام ہیں

شخصیت سازی میں مشرق و مغرب دونوں ناکام ہیں، مغرب کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد صرف

---

[1] ترمذی و ابن ماجہ ومشکوٰۃ باب اعداد آلۃ الجہاد

دنیوی مفاد ہے۔ اس بنا پر ان ہی صفات کو نمایاں حیثیت دی گئی جن سے یہ مفاد وابستہ تھا، لیکن مشرق اپنے بلند دعووں کے باوجود چند اخلاقیات کی اصلاح سے آگے نہ بڑھ سکا۔

تشکیل جدید میں متوازن شخصیت کا نمونہ اللہ کا رسولؐ ہے

تشکیل جدید میں متوازن شخصیت کا نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے،

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (احزاب - ۳)	بیشک اللہ کے رسولؐ میں تمہارے لیے عمدہ نمونہ ہے۔

دوسری جگہ ہے

لیکون الرسول شہیداً علیکم وتکونوا شہداء علی الناس (الحج - ۱۰)	تاکہ رسول تمہارے لیے (عملی) گواہ (نمونہ) ہو اور تم لوگوں کے لیے گواہ ہو۔

ایک اور جگہ ہے:

وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا (بقرہ - ۱۷)	اسی طرح ہم نے تم کو نہایت معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے لیے گواہ ہو اور رسولؐ تمہارے لیے گواہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ جس قدر جامع صفات اور تمام گوشوں پر حاوی تھی وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے۔

شخصیت سازی کا نمونہ صحابہ کرامؓ کی زندگی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شخصیت سازی کا نمونہ صحابہ کرامؓ کی زندگی ہے، جنھوں نے ہر میدان میں وہ کارہائے نمایاں

انجام دیے جس کی نظیر دنیا ابتک نہیں پیش کر سکی، اگر ان کی جدوجہد کسی ایک گوشہ میں محدود رہتی تو اسلامی تہذیب وجود ہی میں نہ آتی، اور اگر اس کی ترقی کا سلسلہ نہ جاری رہتا تو یہ تہذیب اتنے دنوں باقی نہیں رہ سکتی تھی۔

صحابہؓ کی شخصیت سازی کے لیے مسجد نبوی سے متصل صفہ نام کی ایک درسگاہ قائم تھی، جس کی جولانیاں نظم وضبط کے ساتھ اس وقت کی زندگی کے ہر گوشہ تک وسیع تھیں۔ اہل صفہ جن سے ایک خاص قسم کی زندگی پر استدلال کیا جاتا ہے، وہ بھی کسب معاش، تعلیم اور دیگر شہری ذمہ داریوں کی انجام دہی کے ساتھ فوجی مہمات میں رضاکارانہ شریک ہوتے تھے، اہل صفہ کے چند نام یہ ہیں: حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، حذیفہ بن یمانؓ، عبد اللہ بن عمرؓ، سلمان فارسیؓ، ابو درداءؓ، ابو ہریرہؓ، سالمؓ، ابو ذر غفاریؓ، حنظلہؓ، بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ وغیرہ۔[1] ان لوگوں کے کارناموں سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی شخصیت سازی کس قسم کی کی تھی۔

شخصیت سازی کیلیے بنیادی اصول

قرآن حکیم سے شخصیت سازی کے حسب ذیل بنیادی اصول مستنبط ہوتے ہیں:-

(۱) معرفت (۲) افادیت (۳) امانت (۴) رعایت (۵) عدالت، (۶) عملیت

اس کی تشریح یہ ہے:-

معرفت

(۱) معرفت یہ ہے کہ زندگی میں خودشناسی وخداشناسی کے جوہر نمودار ہوں، جس سے ایک طرف عزت نفس، وسعت نظر، شجاعت، قناعت، استغنا وغیرہ صفات

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۱ و ۲، مسند ابن حنبل ج ۱ وغیرہ۔

پیدا ہوں اور دوسری طرف انکساری، امید، خوف، توکل، ضبط و تحمل وغیرہ صفات ظاہر ہوں،

قرآن حکیم میں ہے:۔

وفی انفسکم افلا تبصرون (جاثیہ ۱۰)

اور اپنے نفسوں میں کیا تم نہیں غور کرتے،

دوسری جگہ ہے:

ذلک بان اللہ لم یک مغیراً نعمۃ انعمھا علی قوم حتی یغیروا ما بانفسھم (انفال: ۷)

بے شک اللہ اس حالت کو کبھی نہیں بدلتا جو کسی قوم کو حاصل ہوتی ہے، جب تک وہ خود ان چیزوں کو نہ بدلے جو اسکی ذات کے ساتھ وابستہ ہیں،

خدا شناسی سے بغیر صحیح معنوں میں خود شناسی نہیں پیدا ہو سکتی،

ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰھم انفسھم (حشر: ۳)

ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا پھر اللہ نے انکو اپنی ذات سے بھلا دیا،

افادیت

(۲) افادیت یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی فطری صلاحیت کے لحاظ سے مفید بنایا جائے، اس کے لیے مادی، اخلاقی اور روحانی وجسمانی دونوں قسم کی صلاحیتوں سے آراستہ ہونا ضروری ہے،

قرآن حکیم میں ہے:

انزل من السماء ماءً فسالت اودیۃ بقدرھا فاحتمل السیل زبداً رابیاً ومما یوقدون علیہ فی النار ابتغاء حلیۃ او متاع زبد مثلہ کذلک یضرب اللہ الحق والباطل فاما الزبد فیذھب جفاءً واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (رعد: ۳)

اللہ نے آسمان سے پانی برسایا جس سے نالے ندیاں اپنی مقدار کے مطابق بہنے لگیں، اور سیلاب کی روانی اوپر اوپر جھاگ پیدا کر دی، ایسی جھاگ اس وقت بھی پیدا ہوتی ہے جبکہ زیور اور دوسری چیزیں بنانے کے لیے دھاتوں کو آگ میں پگھلاتے ہیں، اللہ حق و باطل کی ایسی ہی مثال دیتا ہے، دیکھو جھاگ تو ناچیز اور ناکارہ ہو کر معدوم ہو جاتی ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے نفع بخش اور کارآمد ہے وہ باقی رہتی ہے۔

پانی، سونا، چاندی اور دوسری دھاتیں چونکہ نافع ہیں اس لیے باقی رہتی ہیں اور اوپر کی جھاگ چونکہ غیر نافع ہے، اس لیے ختم ہو جاتی ہے، اس سے یہ اصول نکلتا ہے کہ دنیا میں بحیثیت مجموعی جو نافع ہو اس کو بقاء و پائداری حاصل ہوتی اور جو غیر نافع ہو وہ بتدریج ختم ہو جاتی ہے،

مسلم معاشرہ میں نافعیت کچھ اخلاق کی اصلاح میں محدود کر کے مادی طاقت دنیا والوں کے حوالہ کر دی گئی، جس کا نتیجہ ہر جگہ ذلت و پسپائی میں نکلا، بالفرض اگر یہ اخلاق درست بھی ہو جائیں تب بھی مادی طاقت کے بغیر ترقی و سر بلندی نہیں حاصل ہو سکتی،

اس غلط روی کے دو سبب ہیں:۔

(۱) مذہب کے غلط تصور نے یہ خیال پیدا کر دیا کہ صرف مذہبی مراسم و اعمال کی پابندی سے وہ سب کچھ مل جائے گا جس کو دنیا والے انتھک جد و جہد اور محنت سے حاصل کرتے ہیں جو قانون عدل کے خلاف ہے۔

(۲) معجزات و کرامت سے یہ سمجھ لیا گیا کہ جس طرح مادی سبب کے بغیر ان کا

ظہور ہو گیا تھا، اسی طرح مادی طاقت کے بغیر قومی ترقی و سربلندی حاصل بھی ہو جائے گی، حالانکہ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے، بلاشبہ آگ کی خاصیت جلانا ہے، جو شخص اس میں ہاتھ ڈالے گا، وہ لازمی طور سے جل جائے گا، اگر ابراہیم علیہ السلام کے حق میں آگ گلزار بن گئی تو یہ معجزہ ہے، جس کا عام قانون سے کوئی تعلق نہیں، دنیا کا نظام عام قانون کے تحت چلتا ہے، نہ کہ معجزہ و کرامت کے تحت،

امانت (۳) امانت، یہ تصور ابھارا جائے کہ زندگی کی بنیاد امانت پر قائم ہے، اور دنیا میں انسان کی حیثیت "امین" کی ہے، جس کو ہر کام اور ہر بات کی اصل مالک کے سامنے جوابدہی کرنی ہے، قرآن حکیم میں ہے:

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا
الامانات الی اھلھا (نساء ۸)

بیشک اللہ تمھیں اس بات کا حکم دیتا ہے
کہ امانتوں کو انکے اہل تک پہنچاؤ،

آیت میں امانت کا مفہوم عام ہے، جو ہر قسم کی ذمہ داری کو شامل ہے، خواہ اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت کو ایمان کا مدار و موقوف علیہ قرار دیا ہے،

لا ایمان لمن لا امانة له[1]

جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں،

دوسری حدیث میں ہے

اول ما تفقدون من دینکم
الامانة و آخر ما تفقدون الصلوٰة
وسیصلی قوم لا دین لھم[2]

تم اپنے دین سے جس چیز کو سب سے پہلے گم کر دگے
وہ امانت ہے اور آخر میں جس کو گم کر دگے وہ
نماز ہے، کچھ لوگ نماز پڑھتے رہیں گے لیکن دین

[illegible]

---

[1] بیہقی، شعب الایمان (مشکوٰۃ کتاب الایمان الفصل الثانی [2] بیہقی ج ۶ ص ۲۸۹

رعایت (۴) رعایت یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اور دوسروں کی ذمہ داری محسوس کرے اور جس کو جس وقت اخلاقی و مادی جس قسم کے تعاون کی ضرورت ہو اس کو اپنا فرض جانے، چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

یا ایھا الذین آمنوا قوا
انفسکم واھلیکم ناراً

اے ایمان والو اپنی جان کو اور اپنے
اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

دوسری جگہ اللہ نے خلق خدا کی ضرورت پوری کرنے کو اپنے لیے قرض حسنہ دینے سے تعبیر کیا،

من ذا الذی یقرض اللہ
قرضاً حسنا (البقرہ ۳۲)

کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا کلکم راع ومسئول عن
رعیتہ
(بخاری کتاب الاستقراض)

غور سے سن لو، ہر شخص تم میں کا راعی ہے
اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے
میں باز پرس ہوگی،

"راعی" کے معنی

حفظ الغیر لمصلحتہ (بیضاوی)

دوسرے کی حفاظت اسکی مصلحت کے مطابق کرنا

اس لحاظ سے راعی

کل من ولی امر قوم (المنجد)

ہر وہ شخص ہے جو کسی کا منتظم و نگراں ہو

دوسری جگہ

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق

مخلوق اللہ کی عیال ہے، اللہ کے نزدیک

الی اللہ من احسن الی عیالہ

(مشکوٰۃ باب فی الشفقۃ علی الخلق)

زیادہ پسندیدہ وہ شخص ہے جو اسکے عیال کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

مذکورہ "رعایت" خاص جذبہ کے تحت ہونی چاہیے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت کی ہے،

"فرض کرو ایک بحری جہاز ہے جس کے اوپر نیچے لوگ بیٹھے ہیں، اور سب کی ضرورت کا سامان (پانی وغیرہ) جہاز کے بالائی منزل پر رکھا ہے، نچلے حصہ کے لوگ پانی کے لیے اوپر آتے رہتے ہیں، اگر اوپر والے جذبۂ اشتراک کے تحت پانی دیدیتے ہیں تو سب کا کام اطمینان سے چلتا رہتا ہے، کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں پیش آتا، لیکن اگر یہ لوگ اس بنا پر پانی دینے سے انکار کرتے ہیں کہ ان کے آنے سے معمولی تکلیف ہوتی ہے تو وہ پانی کی فراہمی کے لیے دوسری تدبیر کرنے پر مجبور ہوں گے، بالآخر ایسی حالت میں انھوں نے یہ سوچا کہ چھوٹا سوراخ کرکے سمندر سے پانی حاصل کیا جائے، چنانچہ وہ سوراخ کرنے لگے، اب اگر اوپر والے نہ اس سے روکیں اور نہ پانی کا بند وبست کریں تو ظاہر ہے کہ جہاز ڈوب جائے گا، پھر نہ سوراخ کرنے والے بچیں گے اور نہ اس سے چشم پوشی وغفلت کرنے والے۔"[1]

حدیث میں زندگی کو سمندری جہاز پر سواری کے ساتھ تشبیہ دینا اس کی ضروریات کو پانی جیسی اہم چیز کے ذریعہ بیان کرنا، تکلیف کے باوجود تعاون واشتراک کے جذبہ کو نظر انداز نہ ہونے دینا اور خلاف ورزی کی صورت میں جہاز میں سوراخ ہونا، (اگرچہ یہ سوراخ اہم ضروریات کے لیے کیا گیا ہو) اور اس کے نتیجہ میں جہاز ڈوب جانا یہ ساری باتیں زندگی کی نفسیات اور اس کی ذمہ داریوں کو سمجھنے کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں،

---

[1] بخاری ومشکوٰۃ باب الامر بالمعروف

عدالت

(۵) عدالت یہ ہے کہ زندگی کے تمام گوشوں میں عدل وتوازن پیدا کیا جائے تاکہ افراط وتفریط سے بچ کر ہر شئی اعتدال کے ساتھ اپنے محل وحدود کے اندر رہے، عدالت کی تفصیل اوپر گذر چکی،

قرآن حکیم نے غلو پسندی کی ممانعت، زندگی میں عدل واعتدال پیدا کرنے کے لئے کی ہے،

یا اہل الکتب لا تغلوا فی دینکم ولا تقولوا علی اللہ الا الحق (نساء - ۲۳)

اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو (حقیقت واعتدال سے گزر نہ جاؤ) اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا اور کچھ نہ کہو۔

دوسری جگہ ہے:

قل یا اہل الکتب لا تغلوا فی دینکم غیر الحق ولا تتبعوا اھواء قوم قد ضلوا من قبل واضلوا کثیرا وضلوا عن سواء السبیل (مائدہ - ۱۰)

آپ کہہ دیجئے اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اس گروہ کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے گمراہ ہو چکا ہے، اور سیدھے راستہ سے وہ بھٹک گیا ہے،

عدل واعتدال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

لا تشددوا علی انفسکم فیشدد اللہ علیکم فان قوما شددوا علی انفسھم فشدد اللہ علیھم فتلک بقایاھم فی الصوامع والدیار

تم اپنے اوپر سختی نہ کرو ورنہ اللہ تمہارے اوپر سختی کریگا کیونکہ پہلے جس قوم نے اپنے اوپر سختی کی اللہ نے بھی اس پر سختی کی، یہ عیسائیوں اور یہودیوں کے عبادت خانوں میں ان ہی کے بقایا لوگ (انہی کے مذہبی پیشوا) ہیں

ایک مرتبہ تین صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر اس غرض سے حاضر ہوئے کہ آپ کی گھریلو عبادت کا پتہ لگائیں، جب انھیں بتایا گیا تو ان کی نظر میں وہ عبادت زیادہ معلوم ہوئی، لیکن یہ سوچ کر اطمینان کر لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو بخشے بخشائے ہیں، اور ہم گنہگار ہیں، ہمارا آپ کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے؟ اسی وقت ایک نے عہد کیا کہ وہ ہمیشہ شب بیداری کرتا رہے گا، دوسرے نے کہا کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھے گا، تیسرے نے کہا کہ وہ شادی نہیں کرے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب باہر سے تشریف لائے اور اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو آپ نے ان تینوں کو بلا کر سختی کے ساتھ اعتدال کی زندگی گذارنے کا حکم دیا اور فرمایا :-

اما واللہ انی لاخشاکم للہ و	یاد رکھو، خدا کی قسم میرے اندر تم سے زیادہ
اتقاکم لہ لکنی اصوم وافطر	تقویٰ اور خدا کا خوف ہے، لیکن میں کبھی
واصلی وارقد واتزوج النساء	روزہ رکھتا اور کبھی افطار کرتا ہوں،
فمن رغب عن سنتی فلیس	کبھی نماز پڑھتا اور کبھی سوتا ہوں اور عورتوں
منی (ابوداؤد و مشکوٰۃ کتاب الاعتصام	سے شادی کرتا ہوں، جو شخص میری سنت سے اعراض
بالکتاب والسنۃ الفصل الاول وبخاری ومسلم)	کریگا وہ مجھ (میری جماعت) سے نہیں ہے،

عملیت (۶) عملیت یہ ہے کہ انسان کی زندگی سرتاپا عمل بنجائے، یعنی خوش فہمی و خود فریبی کی دنیا سے نکل کر کارکردگی کی صلاحیت کو مرکزی حیثیت دیجائے۔

قرآن حکیم میں ہے:

وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم	آپ کہہ دیجئے تم کام کرو، اللہ اور اس کا
ورسولہ (التوبہ - ۱۳)	رسول تمھارا کام دیکھے گا۔

دوسری جگہ ہے

وان لیس للانسان الا	انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ
ماسعی (النجم - ۳)	کوشش کرتا ہے۔

ایک اور جگہ ہے :-

نوف الیھم اعمالھم فیھا (ہود - ۲)	دنیا میں کام کا بدلہ ہم پورا پورا دیتے ہیں،

حسب ذیل حدیث سے کارکردگی کی صلاحیت اور اس کی وقعت کا اندازہ ہوتا ہے،

تین شخص کام کرنے والے ہیں، ایک نے صبح سے دوپہر تک کام کیا، دوسرے نے دوپہر سے عصر تک اور تیسرے نے عصر سے مغرب تک، پہلے دونوں کو ایک ایک قیراط اجرت ملی اور تیسرے کو دو قیراط ملے، پھر فرمایا کہ پہلے دو یہود و نصاریٰ ہیں اور آخری شخص یہ امت ہے (اس میں دونوں کے مقابلہ میں کارکردگی کی صلاحیت اتنی زیادہ ہے کہ) کم وقت میں کام کرکے دوگنی اجرت وصول کی[1]

اس صلاحیت کی بدولت بدعملیوں کی سزا کا التوا

کارکردگی کی صلاحیت کا اثر یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی بدولت بدعملیوں کی سزا ملتوی کر دیجاتی ہے، کیونکہ فوری سزا دینے سے نظام عالم میں خلل واقع ہوتا ہے، اور کائنات کی ترقی متاثر ہوتی ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں :-

ان الحق لایدع عاصیا الا	بیشک حق کسی گنہگار کو اس دنیا میں
الا یجازیہ فی الدنیا مع	سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا (البتہ سزا میں
رعایۃ ذلک النظام[2]	دنیوی نظام کی رعایت ضروری ہوتی ہے)

---

[1] مشکوٰۃ باب ثواب ہذہ الامۃ ۔ [2] ولی اللہ حجۃ اللہ البالغۃ باب الجزاء علی الاعمال فی الدنیا۔

اس کے بعد کہتے ہیں

وربما کان حکم النظام اوجب	بسا اوقات "نظام" کا حکم اعمال کے حکم
من حکم الاعمال فیستدرج	سے زیادہ تاکیدی ہوتا ہے، اس
بالفاجر ویضیق علی الصالح	بنا پر فاجر کو ڈھیل دیجاتی اور
فی الظاهر ویصرف التضییق	صالح پر تنگی کی جاتی ہے، یہ تنگی
الی کسر بهیمته[1]	اس کی شہوانی قوت کے توڑنے میں
	کام آتی ہے،

ہماری نظر صرف ایک پہلو کو دیکھتی ہے اور "قدرت" مجموعی حیثیت کو دیکھتی ہے	ترقی یافتہ ممالک میں لوگوں کو اگر بدعملیوں کی سزا نہیں مل رہی تو اس کی وجہ صرف کارکردگی کی صلاحیت

اور کائناتی تصرفات میں ترقی ہے، ایسا نہیں ہے کہ اس دور میں برائیوں کے خواص بدل گئے یا وہ بھلائیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں، ہماری نظر صرف ایک پہلو پر ہوتی ہے، اور قدرت مجموعی حیثیت کو دیکھتی ہے، اگر ہم بھی تمام پہلوؤں کو دیکھنے لگیں تو قدرت کے کسی فیصلہ میں شکوک و شبہات نہ پیدا ہوں،

(باقی)

[1] ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ باب الجزاء علی الاعمال فی الدنیا

معارف کے پرانے پرچے

ماہنامہ معارف علم و ادب کا ایک خزانہ ہے، ہر مہینہ اسکے کچھ پرچے بچ بھی جاتے ہیں، جنکا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، لیکن وہ مسلسل نہیں ہیں، اسکے مستقل خریداروں اور عام شائقین کو جن پرچوں کی ضرورت ہو وہ خط و کتابت کے ذریعہ معلوم کر کے انکو طلب کر سکتے ہیں، ہدیہ فی پرچہ ۵۰ پیسے اور اگر کسی سال کے اتفاق سے مسلسل ہوں گے تو کل کا محض آٹھ روپے۔

منیجر

سیاست میں اسلام

مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی ایم اے رفیق دار المصنفین

(۶)

سعودی عرب

۱۹۶۹ء تک سعودی عرب کے بارے میں مغربی خیالات میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہی، اور اخبارات اس عنوان پر خصوصی مقالے شائع کرتے رہے کہ عرب کی قدامت پرست سوسائٹی کو کس طرح تجدد کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، وہاں کا قانون عدل و انصاف، تیل کی آمدنی کا فیاضانہ خرچ، اور ملک کی اسی قسم کی اور کئی خصوصیات ایک عرصہ تک اخبار کا موضوع سخن بنی رہیں، لیکن ۱۹۶۴ء میں جب شاہ فیصل نے اپنے نااہل بڑے بھائی کو ہٹا کر عنانِ حکومت خود سنبھالی، تو ان کی پالیسیاں ان کے ملک اور سعودی خاندان میں بڑی دلچسپی کا باعث بن گئیں، اب اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ملک پھر پرانی اقدار کی طرف لوٹے، اور شاہ سعود کے مضرت رساں اور مضحکہ خیز دورِ حکومت کے بعد فیصل نے بین الاقوامی افق پر سعودی عرب کے لیے جو راہ متعین کی ہے، اس سے واپس جا سکے، یہ اتفاق کی بات ہے کہ یہ تغیرات ایک ایسے بادشاہ نے کیے ہیں، جو اپنی شخصی زندگی میں بہت ہی غور و فکر کرنے والا، ضمیر سے رہبری لینے والا اور خود ستائی سے دور رہنے والا ہے، انھوں نے سعودی عرب کے لیے جو نئی راہ متعین کی ہے، اسکا سبب

نمایاں پہلو اسلامی ممالک کے اتحاد کی کوشش ہے، کیونکہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ بین الاقوامی معاملات میں سعودی حکومت زیادہ دنوں تک منفی کردار کی حامل نہیں رہ سکتی،

اسلامی اتحاد کی پالیسی کے متعلق عام خیال یہ ہو کہ یہ ایک غلط اور بے معنی قدم ہے، کچھ مبصرین کا یہ بھی خیال ہو کہ امریکہ کے اسوقت کے وزیر خارجہ نے شاہ سعود سے ملکر مشرق وسطی کی کارروائیوں اور اقتدار کا مرکز دوسری جگہ ہٹانے کے لیے جو خاکہ مرتب کیا تھا، اسلامی اتحاد کی پالیسی اس کا ایک جزو ہے، لیکن شاہ فیصل کا خیال یہ ہے کہ مشرق وسطی کے ممالک میں انقلابی تحریکات سے دفاع کا بہترین ذریعہ یہی پالیسی ہے، اور قاہرہ، دمشق اور بغداد میں ہونے والا ردعمل ان ممالک کی باہمی چشمک کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ شاہ فیصل کسی طاقت کے بھی آلہ کار نہیں ہیں، اور سعودی عرب کے دوسرے ممالک سے تعلقات قائم رکھنے کے بارے میں ان کا وہی طرز عمل ہے جو پامرسٹن کا تھا، ان کے خیال میں اسلامی اتحاد اس لیے بھی ضروری ہے کہ سعودی عرب کو بیرونی خطرات درپیش ہیں، مگر ان کا یہ اندازہ غلط ہے، بغداد اور دمشق میں ہونے والے واقعات اور مصر میں بڑھتی ہوئی بے اطمینانی اس بات کا مظہر ہے کہ مشرق وسطی کے ان تمام حالات میں انقلاب کے علمبردار آپس ہی میں ایک دوسرے سے لڑتے رہنے کے عادی ہیں، سچ تو یہ ہے کہ اسلامی اتحاد کی پالیسی پر نکتہ چینی کا کوئی معقول جواز نہیں ہے، کچھ مسلمان اس تحریک پر اس لیے نکتہ چینی کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس تحریک کے ذریعہ سیاسی اغراض کی تکمیل کے لیے اسلام کا نام لیا جارہا ہے،

اگر یہ بات صحیح بھی ہو تب بھی اتنی نقصان دہ نہیں جتنی یہ کوشش کہ اسلام اور کمیونزم کو ہم پلہ قرار دیا جائے، یا قرآن کے معنی پہنا کر سوشلزم کو آگے بڑھایا جائے، بہرحال ان سب

صورتوں میں انسان اور خدا کے درمیان سیاست دخل انداز نظر آتی ہے، اور تجزیہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی اتحاد کی تحریک سے نہ تو کوئی نقصان ہوا نہ فائدہ، بلکہ یہ تحریک ایک غیر ضروری کوشش تھی،

شاہ فیصل کی خارجہ پالیسی کے دوسرے پہلو بڑی حد تک کامیاب رہے یمن کی خانہ جنگی اور آئے دن مصری فضائیہ کی سعودی علاقوں پر بمباری نے اس حقیقت کو پس پشت ڈال دیا ہے، کہ سعودی عرب کا سب سے مخدوش خطہ مشرقی صوبہ الاحساء ہے، اس لیے یہ ضروری تھا کہ ریاض کی حکومت، ایران، بحرین، قطر اور برطانیہ سے اپنے تعلقات کو بہتر بنائے، چنانچہ سعودی عرب تیل والے ساحلی علاقوں اور خلیج فارس کی سرحد سے متعلق تنازعہ میں ایران سے معاملات طے کرنے میں کامیاب رہا، اس سے ملحق چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے اپنے ترقیاتی فنڈ سے شرکت اور دوام میں مقیم یمن کے امام پر اپنی گرفت مضبوط کرکے سعودی عرب کو مشرقی سرحدوں پر اپنا دفاع مضبوط کرنے میں بھی کامیاب ہوئی ہے، اس سے پہلے ساحلی علاقوں اور زمینی سرحدوں کے بارے میں قطر کے ساتھ پہلے ہی ایک سمجھوتہ ہو چکا تھا، خلیج فارس میں متحدہ دفاعی اقدامات کے بارے میں ایران اور عرب کی بات چیت بھی کم اہم نہیں ہے،

شاہ فیصل اور شاہ سعود کا خیال تھا کہ خلیج فارس سے متعلق سعودی عرب کے حقوق کو سب سے زیادہ خطرہ صدر ناصر سے درپیش ہے، اس لیے ان کو تیل پیدا کرنے والے علاقوں کے صنعتی مزدوروں پر صدر ناصر کے اثرات کو نظرانداز نہ

نہیں کرنا چاہیے۔[1] پھر بھی یہ اثر اب اتنا نہیں ہے جتنا یمن کی خانہ جنگی سے پہلے
یا سویز کی لڑائی کے بعد تھا، ناصر کو جن شکستوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، انکے علاوہ
تین اور باتیں اس سلسلہ میں اہم ہیں، اول یہ کہ شاہ فیصل نے سعودی خاندان
کے لیے ایک نیا وقار پیدا کیا ہے، دوسرے تیل کے ذخائر میں فلسطینی، شامی اور
دوسرے عرب عناصر کو ہٹا کر ان کی جگہ سعودی عرب کے افراد مقرر کیے گئے
ہیں، تیسرے صدر ناصر کے امریکہ کے ساتھ تعلقات نہایت ہی مبہم اور مشکوک ہیں،
سعودی عوام کے دعووں سے صدر ناصر کا وقار جاتا رہا ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں
کہ صدر ناصر کی بقا اس بات پر منحصر ہے، کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے امریکی تعاون
حاصل کرتے رہیں۔

یمن کی سرحد پر شاہ فیصل نے ایسی پالیسی اختیار کی ہے، جو مصری سامراجیت
کا منہ توڑ جواب ہے۔ اور اس پالیسی میں شاہ فیصل نے نہ قوم مرحوم احمد کے نظریہ کو اپنایا
ہے، اور نہ ان کے بیٹے کے نظریہ کو، یمن میں ان کی موجودہ پالیسی ویسی ہی ہے جیسی صوبہ
الاحساء میں، اس پالیسی کا سعودی خاندان سے تاریخی تعلق ہے، اور اس کو نظر انداز
کر کے وہ خطرات میں مبتلا ہو سکتے ہیں، ریاض سے تھوڑے فاصلہ پر پرانے سعودی
دارالسلطنت درعیہ (Dariya) کے کھنڈرات ہیں، جو مصری حملہ میں تباہ ہو گیا تھا
یہ کھنڈر اس واقعہ کی تلخ یادگار ہے، کہ کس طرح اس پر جابرانہ قبضہ ہوا تھا اور
امام عبد اللہ بن سعود کو قید اور بعد میں قتل کر دیا گیا تھا، یہ کھنڈر یہ بھی یاد دلاتا ہے
کہ الاحساء کے بنو خالد اور قطر و بحرین کے خلفا، خالد بن سعود کی طرح دشمنوں سے مل گئے

[1] یہ مضمون صدر ناصر کی موت سے بہت پہلے کا ہے۔

تھے، شاہ فیصل کا خیال ہے کہ اسی قسم کے حملے اور اب یمن کے راستہ سے آرہے ہیں،
اس لیے ان کی پرانی پالیسی میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے، پہلے ان کی سیاست اپنے
خاندان کی تاریخ کے بجائے فلسطینی عربوں کی زبوں حالی سے وابستہ تھی،

فیصل کے خیال میں فلسطین مغربی عیاریوں کا نتیجہ ہے، اور شاہ فاروق
مصر پر حکمرانی کے لیے بالکل نااہل تھے، اور سعودی خاندان کے حکمرانوں میں شاہ
فیصل ہی وہ واحد فرد تھے، جو جمال عبد الناصر کی ابھرتی ہوئی طاقت کی
تائید کرتے تھے، جب مصر کے نئے حکمران نے سوویٹ بلاک سے فوجی اور معاشی
امداد حاصل کی، اس وقت شاہ فیصل کا جو ولی عہد تھے، ردعمل یہ تھا کہ یہ معاہدہ
ایک شیطانی قوت کے ساتھ نہیں ہوا ہے، بلکہ مغرب کی معاندانہ روش نے
عربوں کو کمیونسٹوں سے لین دین کرنے پر مجبور کر دیا ہے، اس لیے ۱۹۵۶ء میں
شاہ سعود اور امام یمن کے درمیان ہونے والے معاہدہ کو شاہ فیصل نے
پسند کیا تھا، اور ان کو یہ اعتراض نہیں تھا کہ اس معاہدہ سے یمن کو روسی اسلحہ
خریدنے کے لیے رقم حاصل ہو سکے گی، ۱۹۵۶ء کے حادثہ سویز کے دوران ولی عہد
فیصل نے مصر کے ذریعہ سویز کی ناکہ بندی اور بحرین کے تیل کے کارخانوں کو بھیجے
جانے والے سعودی خام تیل کو روکنے کی سخت تاکید کی تھی، حالانکہ ان باتوں سے
زبردست معاشی نقصان ہونے کا اندیشہ تھا، لیکن یمن میں صدر ناصر کی پالیسی نے شاہ
فیصل کو سعودی حکومت کی پرانی تاریخ کو سمجھنے کا موقع دیدیا، وہ سویز کے
مشرق میں برطانوی حکومت کی پالیسی سے اتنے ہی نالاں ہیں، جتنا برطانوی پارلیمنٹ
کا کوئی قدامت پرست ممبر ہو سکتا ہے، اور انھیں خوف ہے کہ برطانیہ کی پالیسی

جنوبی عرب میں خطرہ کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے، شاہ فیصل محسوس کرتے ہیں کہ سعودی عرب کا مستقبل یمن کی جنگ سے وابستہ ہے، وہ عرب کو جمہوریہ بنائے جانے کے مخالف نہیں ہیں، لیکن یہ جمہوریہ ایسی ہونی چاہیے جسے یمنی عوام کی اکثریت کی تائید حاصل ہو، مصری فوج کی قائم کردہ نہ ہو، اس لیے سعودی حکومت کی جانب سے یمن کے لیے حق خود اختیاری کا مطالبہ ہی مصری افواج کو وہاں سے نکالنے کا بہترین ذریعہ ہے

بین الاقوامی سیاست میں کویت نے اپنے وقار کو برقرار رکھنے اور ترقیاتی فنڈ کو دانشمندی سے استعمال کرنے میں متوازن رویہ اختیار کیا ہے، اس سے سعودی عرب کو بھی بہت کچھ سبق لینا چاہیے، شاہ فیصل اور سابق صدر جانسن کی ملاقاتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس خطہ کے ترقیاتی منصوبوں میں سعودی عرب بھی باقاعدہ طور پر شریک ہونے کو تیار ہے، لیکن سیاسی حالات سے قطع نظر سعودی عرب اپنی سوسائٹی کے ڈھانچہ کو نقصان پہنچائے بغیر اندرون ملک ترقیاتی اسکیموں پر تیزی سے عمل پیرا نہیں ہو سکتا، اور اس ترقی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں بھی ہیں، جن پر آسانی سے قابو حاصل نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اپنی آمدنی کا ایک حصہ بین الاقوامی میدان میں بھی صرف کرنا سعودی عرب کے لیے ضروری ہو گیا ہے، اس طریقہ سے سعودی حکومت کے زیادہ مضبوط ہونے کے روشن امکانات ہیں،

سعودی عرب کے متعلق جن لوگوں کو مکمل معلومات حاصل نہیں ہیں، ان کے بیانات سے بھی اس ملک کو نقصان پہنچتا رہتا ہے، خصوصاً امریکن عربوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں، امریکہ کے ریڈ انڈین کی طرح عرب اپنے ملک کے اصلی باشندے ہیں، وہ سمندر پار کے کسی ملک سے نوآبادیاتی نظام قائم کرنے کی غرض سے اس خطہ میں

نہیں آگئے تھے، اور نہ یہ چیز کبھی ان کی توجہ کا مرکز رہی کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جائے، عرب کا خطہ ہی ان کی سرزمین ہے، اور ان کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ وہ ہے جس نے ان کی زندگی کو بامقصد بنایا، اور مادہ پرستی کی غلامی سے نجات دلائی، یہ تاریخی واقعہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش تھی جنھوں نے عربوں کو نہ صرف ایک نیا طرز زندگی دیا، بلکہ زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ایک مذہب بھی دیا، لیکن موجودہ دور میں سیکولر ممالک کے جو لوگ بھی سعودی عرب کا دورہ کرتے ہیں، وہ اس واقعہ کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، مغربی مفکرین اس بات سے نہایت متاثر ہیں، کہ سعودی عرب میں کوئی معاشی بحران نہیں ہے، اس کے باوجود ان کی ترقی کی رفتار بہت سست اور غیر یقینی ہے، اس کے دو خاص اسباب بتائے جاتے ہیں، ایک یہ کہ اسلام کی روح وہاں مردہ ہو چکی ہے، دوسرے حکمراں خاندان جاگیردارانہ ذہنیت کا ہے، اس میں سے پہلا اعتراض بالکل غلط اور دوسرا صرف جزوی طور پر صحیح ہے، شاہ فیصل اس کا تہیہ کیے ہوئے ہیں، کہ اسلام کے دائرہ میں رہ کر وہ اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں گے، وہاں دوسری جنگ عظیم کے بعد سے، جب سے تیل کے ذخائر دولت پیدا کرنے کا ذریعہ بنے، ۱۹۶۴ء تک ملک میں کافی ترقی ہوئی ہے، ۱۹۶۶ء میں سعودی عرب جانے والے ہر شخص کو یہ اعتراف کرنا پڑتا، کہ ملک کا معاشی ڈھانچہ آج نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم ہو، جس کا بیس برس پہلے تصور بھی ناممکن تھا، لیکن سعودی عرب کو اس ترقی کی مادی اور اخلاقی قیمت بہت گراں ادا کرنا پڑی اور وہ تباہ کن موڑ پر پہنچ چکا تھا، اس لیے شاہ فیصل نے یہ طے کیا کہ اپنے بھائی کو تخت سے دستبردار کر کے ملک

کی قومی زندگی کو نئی بنیادوں پر استوار کریں، شاہ عبدالعزیز کے دور حکومت میں
حکمراں کی نجی زندگی اور ان کی باریک بینی کو دیکھ کر مذہبی رہنماؤں نے یہ محسوس کیا
تھا کہ قومی زندگی کی تبدیلی میں وہ بھی شریک ہیں، ملک میں ہونے والے حالات نے
وہابی علماء کو پریشانیوں میں بھی ڈالا، لیکن انھیں بادشاہ تک رسائی حاصل تھی،
جو ان سے مشورے کیا کرتا تھا، اور مذہبی زندگی کے بنیادی پہلوؤں پر ان کا ہم خیال
تھا، اس واقعہ نے سعودی عرب کو بلا کسی اندرونی خلفشار کے تجدد کے راستہ پر
چلنے میں مدد دی، لیکن شاہ سعود کے آخری دور میں ان کی خرابی صحت اور لوگوں
کے غلط مشوروں نے وہابی علماء اور سیکولر نظریہ کے حامی لوگوں کے درمیان کا رابطہ
منقطع کر دیا، اور شاہ سعود ابن عبدالعزیز کے بارہ سالہ دور حکومت میں سعودی
عرب کو ایک ایسے حکمراں سے سابقہ رہا جو وقت گذرنے کے ساتھ متلون مزاج ہوتا
گیا، اور جس کے یہاں صلاح و مشورے کے لیے لوگوں کی رسائی نہیں تھی، اور جو
ایک شاہی کونسل کے ذریعہ حکومت کرتا تھا، اور جس کا علماء سے کوئی لگاؤ نہیں تھا
اور ان کے مشوروں کی کوئی شنوائی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے ہر قسم کی تبدیلی کی
مخالفت کرنے کا وہابی رویہ پھر زور پکڑ گیا، اسی کے ساتھ اس زمانہ میں تعمیری اور
ترقی کے کاموں کے لیے دولت کی فراوانی تھی، اس لیے رشوت ستانی اور ناجائز
ذریعۂ آمدنی کی وبا عام ہو گئی، اس میں پرمٹ دینے والے بڑے بڑے سرکاری
افسر ملوث تھے، اس معاملہ میں سعودی اور غیر سعودی باشندوں دونوں کا حال
یکساں تھا، ان کی کوشش یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ دولت کمائی جائے،

وہابیوں کی تنگ نظری نے عوام کی اخلاقی گراوٹ کو جنم دیا جس سے قول و فعل

کے تضاد کی فضا عام ہو گئی، شاہ سعود نے قومی احساس پیدا کرنے کو یکسر نظر انداز کر دیا
جس کی ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں سخت ضرورت تھی، اس سے عوام میں صوبہ جاتی
تعصب پیدا ہو گیا، اور لوگوں نے لفظ "حجازی"، "عسیری" یا "نجدی" پر زیادہ زور دینا
شروع کیا، الاحساء میں معمر امیر سعود ابن جلاوی کی منصفانہ اور اصول پرست حکومت
نے "عرب امریکی تیل کمپنی" کے ترقی پسندانہ اثرات سے مل کر کچھ بہتر حالات پیدا کیے،
الاحساء سعودی عرب کا آزادی پسند صوبہ تھا، وہاں ریاض کی حکومت کو نفرت
کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا، اور فوجی افسروں اور سعودی عرب کے ان نوجوانوں
کے دلوں میں جو بیرونی ملکوں سے تعلیم پاکر آئے تھے، یہ جذبہ پرورش پا رہا تھا، کہ مصری
طرز حکومت کو ملک میں نافذ کیا جائے،

حالات کی یہ میراث شاہ فیصل کو اپنے بھائی شاہ سعود سے ملی، انھوں نے اپنی
ولی عہدی کے زمانہ ہی میں یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان کے اندر معاشی اصلاحات اور
ملک کی ترقی میں پرجوش حصہ لینے کی صلاحیت موجود ہے، مغربی مفکرین ان کی حد سے
زیادہ محتاط طبیعت پر تنقید کرتے تھے، انھیں یہ بھی اعتراض تھا کہ انھوں نے علماء
سے بھی تعلق قائم رکھنے کی پالیسی رکھی ہے، وہ لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ مشرق میں خودداری
اور لیڈرشپ کا جو تخیل ہے، اس میں مادہ پرستی کی کوئی گنجائش نہیں، وہ فیصل کے
پرجوش مذہبی کردار سے بھی واقف نہیں تھے، شاہ سعود کے رخصت ہونے سے کچھ
ہی دنوں پہلے ولی عہد نے فضائیہ کے تربیت یافتہ افسران کے ایک جلسہ میں شرکت
کی، اس جلسہ میں ان افسران کو پائلٹ کا عہدہ دیا جانے والا تھا، اس زمانہ میں چونکہ
کئی افسران جہاز لیکر فرار ہو گئے تھے، اس لیے جہاز کی ٹنکی میں پورا پٹرول نہیں دیا جاتا تھا،

ولی عہد نے ان افسران سے کہا کہ یہ نہایت مذموم حرکت ہے، جو لوگ اپنی تقدیر سعودی عرب کی زندگی سے وابستہ نہیں کرنا چاہتے انھیں اختیار ہے کہ وہ کسی اور ملک کو چلے جائیں، اور حکم دیا کہ تربیت والے جہازوں کی ٹنکی میں پورا پٹرول دیا جایا کرے، اس کے بعد سے فضائیہ کا رکارڈ نہایت شاندار ہو گیا، اور اس میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی، اب بھی شاہ فیصل عوام سے ملتے جلتے اور انھیں باریابی کا موقع دیتے ہیں اس طرح عوام کو سعودی قومیت پر فخر کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے،

اب شاہ فیصل ملک کی ترقی میں علماء کو بھی شریک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس کے پیش نظر ان کی اسلامی اتحاد کی پالیسی بہت مفید ثابت ہوئی ہے مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کے متولی ہونے کی حیثیت سے وہ اس بات سے پوری طرح واقف ہیں کہ عربی خطوں میں قانون و تہذیب پیدا کرنے کا سہرا اسلام کے سر ہے، اس سے روگردانی خلفشار کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے، قوم کے معاشرتی ڈھانچہ کی تعمیر نو اور ترقیاتی و صنعتی اسکیموں سے جو اثرات مرتب ہو سکتے ہیں، ان کا علاج یہی ہے کہ معاشرہ کی بنیاد میں شیرازہ بندی قائم رکھنے کے لیے اسلامی نظریہ حیات کو استعمال کیا جائے شاہ فیصل اپنے پروگراموں میں جس حد تک علماء کا تعاون حاصل کر سکیں گے، اور صاحب اقتدار طبقہ میں جس حد تک اسلامی اخلاقیات کو سمو سکیں گے، اور اہل دانش و افواج میں جس حد تک اسلامی اقدار کا احترام پیدا کر سکیں گے، اسی قدر وہ اپنے ملک کو اسلامی بنیادوں پر ترقی کی راہ پر لیجا سکیں گے۔

اس دور میں تجدد کا مطلب ہے ماہرانہ ٹیکنکی صلاحیت صنعتی صلاحیت اور تربیت یافتہ مزدوروں کی دستیابی، ان چیزوں کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ

مغربی ٹیکنکی ماہروں کو ملک میں آنے کی اجازت دی جائے، اور سعودی عرب کی آبادی بہت مختصر ہے، اس لیے مشرق وسطی کے دیگر ممالک کے تربیت یافتہ مزدوروں کو بھی بلایا جائے، یہ سب باتیں شاہ فیصل کے لیے بہت بڑے مسئلے پیدا کرتی ہیں،

پرانی قدریں آسانی سے ختم نہیں ہوتیں، خصوصاً وہ رسم و رواج جن کے پیچھے کوئی خاص نظریہ بھی کارفرما ہو، کبھی بھی فنا نہیں ہوتا، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری کے آخری ایام میں فرمایا تھا، کہ عرب میں دو مذہب نہیں رہیں گے، یہ ایک ایسی پیشین گوئی تھی، جس کی تکمیل حضرت عمرؓ نے اس طرح کی کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو نجران اور خیبر سے نکل جانے کا حکم دیا، پھر یہ روایت قائم ہو گئی کہ جو کوئی بھی اسلام قبول کرے گا، وہ عرب کہلائے گا، اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مختلف جنسوں کا مرکز عربوں کی سب سے بڑی پناہ گاہ ہے، صرف جنوب کے بہت ہی دور دراز اور ناقابل عبور علاقوں میں یہودی باقی رہ گئے، اور وہ اسرائیل کی حکومت قائم ہونے تک وہاں رہے، الاحساء میں امریکی عرب کمپنی کی تشکیل صرف شاہ عبد العزیز کے ذاتی وقار سے ممکن ہو سکی ہے وہ بھی اس طرح کہ تیل کے یہ ذخائر مکہ اور مدینہ سے کافی دور ہیں، لیکن موجودہ سعودی عرب میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر طبقہ و خیال کے لوگ آزادی سے آ جا سکیں، اس لیے مستقبل میں صرف مکہ اور مدینہ ہی غیر اسلامی نظروں سے بچے رہ سکیں گے، شاہ فیصل کو احساس ہے کہ یہ تبدیلی اچانک نہیں ہونی چاہیے، اس کے لیے علماء اور عوام کی تائید بھی ضروری ہے، یہ عوام مغرب کی بنی ہوئی سستی اور پرکشش چیزوں کی طرف بہت مائل ہوتے ہیں، لیکن انھیں مغربی نظریات سے بہر حال دو

رکھنے کی ضرورت ہے، یہ کام بہت مشکل ہے، اور ہو سکتا ہے کہ ان دونوں نظریات کے درمیان توازن برقرار نہ رہ سکے، شاہ سعود کی دست برداری کے ساتھ ساتھ اخلاقی زوال اور معاشرتی برائیوں کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا ہے، ملک میں اب بھی کارکردگی کی صلاحیت اور ملک کے لیے وقف کر دینے کے جذبہ کی کمی ہے، ابھی تک تو متحدہ سعودی حکومت اور سعودی قومیت کا احساس محض ایک خواب ہے بیرونی ممالک سے آنے والے مزدوروں کے سبب سے یہ کام اور بھی مشکل ہو گیا ہے، ایک ایسے شخص کے لیے جو اپنی عمر کی پچاسویں منزل طے کر چکا ہے، یہ بڑا ہی آزمائشی قدم ہے، سعودی خاندان میں، جو واقعی باصلاحیت اور بامقصد لوگ ہیں، وہ سردست وراثت کی صف میں نہیں آتے، شاہ فیصل حتی الامکان پوری کوشش کر رہے ہیں، لیکن سعودی عرب کا مستقبل نہایت غیر واضح اور غیر یقینی ہے۔

جوزف جے میلون

امریکن یونیورسٹی، بیروت

مولانا وصی احمد محدث سورتی پیلی بھیتی

از جناب مولانا شاہ محمود احمد صاحب قادری استاذ مدرسہ احسن المدارس قدیم کانپور

(۲)

غیر مقلدوں کی تردید میں سرگرمی

مولانا وصی احمد محدث سورتی کو غیر مقلدین کے افکار و مسائل و عقائد کی تردید سے بڑا شغف تھا، اور اس میں بڑی سرگرمی دکھاتے تھے، انھوں نے اپنی مشہور کتاب جامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد کے ذریعہ جسے انھوں نے تین سوالوں کے جواب میں لکھا تھا، وہابیوں کے اخراج مساجد کا فتویٰ صادر کیا اور اس زمانے کے تمام مشاہیر علماء مولانا محمد علی کانپوری مونگیری المتوفی ۱۳۴۶ھ، مولانا عبد الحق صاحب تفسیر حقانی، مولانا عزیز الرحمٰن مفتی مدرسۂ دیوبند، مولانا رشید احمد گنگوہی المتوفی ۱۳۲۳ھ، مولانا محمود الحسن المتوفی ۱۳۳۹ھ، ملا محمود صدر مدرس مدرسۂ دیوبند ۱۳۱۶ھ، مولانا قاری عبد الرحمٰن محدث پانی پتی المتوفی ۱۳۱۴ھ وغیرہ نے جامع الشواہد پہ تصدیقی و تائیدی دستخط ثبت کیے، یہ فتویٰ ۱۳۰۰ھ میں چھپ کر شائع ہوا، اور دوسری مرتبہ ادیب شہیر مولانا عبد العلی آسی مدراسی المتوفی ۱۳۲۶ھ نے اپنی کتاب تنبیہ الوہابیین کے ص ۴۴۱ تا ۴۰۱ پہ شائع کیا،

غیر مقلدین کے مسائل کی تردید میں مولانا آسی اور محدث سورتی کی طرح مولانا منصور علی ابن مولانا حسن علی مرادآبادی بھی پیش پیش تھے، انھوں نے جب الظفر المبین

مؤلفہ مولانا غلام محی الدین کے رد میں فتح المبین لکھی تو محدث سورتی نے ذیل کا قطعہ اس کی تاریخ طباعت میں کہا:-

ذرا انصاف کی آنکھوں سے لے وہابیو دیکھو — کتاب اب یہ مصنف نے لکھی کیا دلکش عمدہ
جوابات اس میں سب ثابت ہیں قرآن اور حدیثوں سے — ہر اک بات اس کی اردو میں ہوئی کیا دلکش عمدہ
کتاب اس حسن وخوبی کی نہیں چھاپی گئی ابتک — کہ خطاطانِ خوشخط نے لکھی کیا دلکشا عمدہ
عجب پھولا ہے باغ حوض اسکا نہر جدول سے — اور اس کی لوح وپیشانی بنی کیا دلکشا عمدہ
ہے اسکا نسخ ونستعلیق ہر اک خوشنما خوشخط — خفی کیا دلکش عمدہ، جلی کیا دلکشا عمدہ
ضمیمے کو جو دیکھا، خصم منکر بھی یہ بول اٹھا — کہ حق بات اس میں ظاہر ہوگئی کیا دلکشا عمدہ
جو پوچھا سال چھپنے کا لبِ ہاتف سے یوں نکلا — کتاب رد محی الدین چھپی کیا دلکشا عمدہ ۱۳۰۱ھ
جو کا تو سہروبالی کا، تماشا ہے اسی سن میں — سن تصنیف ہویدا دیکھی کیا دلکشا عمدہ[1]

مولانا وصی احمد محدث سورتی نے منکرین تقلید کی تردید جس شد ومد سے کی تھی، اس کا اندازہ مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ لکھنؤ کی اس تحریر سے بخوبی ہوتا ہے:-

وکان من الفقہاء المتعصبین علی من یعمل بنصوص الحدیث، کثیر النکیر علیھم جمع اقوالا شتی من کتبھم وجعل تلک الاقوال مذھبھم وحملھا علی معان یکفر بھا قائلوھا تارۃ علی سبیل اللزوم واخری علی اعتبار مفھوم المخالف. فکفر بھا کل من یعمل ویعتقد بالحدیث وافتی باخراجھم من المساجد، وجد واجتھد فی اثبات

۱؎ فتح المبین ص ۲۳۷

التوقیعات عن الفقہاء[1]

علم وفضل محدث سورتی علوم اسلامیہ پر گہری نظر رکھتے تھے، اور فقہ وتفسیر، منطق وفلسفہ کی امہاتِ کتب کا درس دیتے تھے لیکن ان کا خاص موضوع "فن حدیث" تھا، انھوں نے کامل پچاس[2] سال درس حدیث میں گزارے، بے شمار احادیث مع اسناد ان کو یاد تھیں، صبح سے ظہر تک اور ظہر سے رات تک درس دیتے تھے، انھوں نے بے وضو کبھی کسی کتاب حدیث کو ہاتھ نہیں لگایا، اور نہ اس کا درس دیا، دوران درس میں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کو ادا کرنے کے بعد قدرے توقف فرماتے تھے،[3]

حدیث کی تدریس میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری ان کو اپنا جانشین کہتے تھے، علامہ ہدایت اللہ خاں فاضل رامپوری المتوفی ۱۳۲۶ھ مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا عبدالوہاب فرنگی محلی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا شاہ فضل الرحمٰن قدس سرہم فن حدیث میں ان کی مہارت کے معترف تھے، بلکہ اول الذکر اور آخری تین بزرگ اپنے شاگردوں کو دورۂ حدیث کے لیے انکے پاس بھیجا کرتے تھے،

اخلاق وعادات عادات واخلاق میں بڑے سادہ فراج اور خلیق تھے، لباس مختصر، معمولی اور غذا سادہ استعمال کرتے تھے، علماء ومشائخ اور سادات کرام کا بڑا اکرام کرتے تھے، عام مسلمانوں سے ہمدردی اور طلبہ سے بڑی محبت رکھتے تھے، غریب طلبہ کی امداد واعانت ان کا خصوصی وصف تھا، غرور وتکبر اور غیبت وبدگوئی سے سخت نفرت تھی، ترویج سنت سے خصوصی شغف تھا، تصوف سے اگرچہ لگاؤ تھا، مگر خانقاہی زندگی

۱؎ نزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۵۱، ۲؎ تحریر قاری احمد صاحب ۳؎ مولانا ہدایت اللہ رامپوری کے احوال کے لیے تذکرہ علمائے اہل سنت، مرتبہ راقم سطور، اور تذکرہ کاملان رامپور مرتبہ حافظ احمد علی شوق دیکھی جائے

سے ہمیشہ گریزاں رہے، ان کا دل مسجد و مدرسہ میں زیادہ لگتا تھا، سنت کی پیروی کو سب سے بڑی کرامت اور فقیری تصور کرتے تھے، غیر شرعی پیروں، فقیروں اور نام نہاد صوفیوں سے سخت بیزار تھے،

داڑھی منڈے حکیم اور ڈاکٹر سے علاج کرانا بھی ناگوار تھا، خلاف سنت مجالس و تقاریب میں شریک نہیں ہوتے تھے، انکو کسی کے ساتھ بداخلاقی اور غصہ سے پیش آتے نہیں دیکھا گیا،

معاصر علماء سے تعلقات معاصر علماء و مشائخ میں مرشد زادہ مولانا احمد میاں جانشین حضرت مولانا فضل رحمٰن، تاج الفحول مولانا عبد القادر بدایونی، مولانا سلامت اللہ رامپوری المتوفی ۱۳۰۱ھ[1] جانشین مولانا ارشاد حسین رامپوری المتوفی ۱۳۱۲ھ، مولانا ریاست علی خاں فاضل شاہجہانپوری المتوفی[1] ۱۳۴۹ھ مؤلف زلالین شرح جلالین، مولانا سید شاہ عبد الصمد سہسوانی حافظ بخاری المتوفی ۱۳۲۳ھ، مولانا احمد حسن کانپوری المتوفی[2] ۱۳۲۲ھ مولانا حکیم نعیم الدین مرادآبادی المتوفی ۱۳۶۷ھ[3]، مولانا سید دیدار علی شاہ[4]

[1] ان کے حالات کے لیے نزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۱۵۷ اور تذکرہ علماء اہل سنت ملاحظہ ہو[2]، نامی گرامی عالم محدث صوفی تھے، نزہۃ الخواطر جلد ہشتم اور تذکرہ علماء اہل سنت، الملفوظ مصابیح القلوب مرتبہ حکیم ظہیر السجاد پھپھوندوی تذکرہ علماء حال، تاریخ مشائخ چشت، مرتبہ خلیق احمد نظامی ایم اے، اور نشاط حافظ، مرتبہ نواب حاجی غلام محمد حافظی اور اکمل التواریخ جلد دوم مرتبہ ضیاء القادری، ان کے احوال کے لیے دیکھی جائے۔

[3] مولانا احمد حسن کے حالات کے لیے نزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۳۴ و تذکرہ علمائے اہل سنت ص ۵۰ تا ۲۰ ملاحظہ ہو[4] حیات صدر الافاضل مرتبہ مولانا معین الدین مرحوم، تذکرہ علماء اہل سنت، حیات اعلیٰ حضرت جلد چہارم آخری (قلمی) میں ان کے حالات تفصیل سے مذکور ہیں،

امروہی[1]، مولانا سید پیر مہر علی شاہ[2]، مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی[3] المتوفی ۱۳۲۲ھ مولانا عبد الباری فرنگی محلی المتوفی ۱۳۴۴ھ، مولانا شاہ مطیع الرسول عبد المقتدر بدایونی المتوفی ۱۳۳۴ھ، مولانا احمد رضا بریلوی، شیخ المشائخ شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی[4] المتوفی ۱۳۵۵ھ قدست اسرارہم سے محدث سورتی کے خصوصی تعلقات تھے،

تلامذہ و اولاد محدث سورتی کے چند خصوصی اور نامور تلامذہ کے نام یہ ہیں،

(۱) مولانا سید سلیمان اشرف، قصبہ بہار شریف محلہ بیرداد ضلع پٹنہ کے باشندے تھے علامہ ہدایت اللہ خاں فاضل رامپوری سے تکمیل درسیات کر کے محدث سورتی کی خدمت میں حاضر ہوئے، دورۂ حدیث کے بعد سند فراغت حاصل کی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ

[1] مولانا دیدار علی شاہ امروہہ کے باشندے تھے، مولانا شاہ ارشاد حسین رامپوری، مولانا احمد علی سہارنپوری سے تکمیل علوم کر کے مولانا گنج مرادآبادی سے مرید ہوئے، خلافت پائی، وہ زبردست عالم محدث معقولی اور صاحب تدریس بزرگ گزرے ہیں، ۱۳۵۴ھ سنہ وفات ہے، مرقد لاہور میں ہے تفصیل کے لیے نقوش لاہور نمبر ص ۲۸۰ و تذکرہ شعرائے پنجاب فارسی ص ۱۵۰، الیواقیت المہریہ ص ۱۱۷، تذکرہ علماء اہل سنت ص ۹۳ و ۹۴ ملاحظہ ہو،

[2] پنجاب کے نامور بزرگ و متبحر عالم، احوال کے لیے تذکرہ علماء اہل سنت ص ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶ تاریخ مشائخ چشت تذکرہ صوفیائے پنجاب، تذکرہ پیر گولڑہ مرتبہ مولانا فیض احمد (قلمی) الیواقیت المہریہ ص ۱۰۵ دیکھی جائے

[3] حالات کے لیے تذکرہ علماء اہل سنت ص ۲۴۴ - ۲۴۵، نزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۲۲۵ - ۲۲۶، ۲۲۷، مولانا محمد حسین الہ آبادی مرتبہ مولانا محمد میاں الہ آبادی ملاحظہ ہو[4] مرکز علم فرنگی محل کے نامور عالم و عارف تھے، انکی ذات سے علماء ہند کو بڑا فیض پہنچا، بہت مختصر سی عمر پائی، ۱۳۴۴ھ میں فوت ہوئے، تذکرہ علماء اہل سنت ص ۱۲۳، ۱۲۴ اور نزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶ [5] کچھوچھہ ضلع فیض آباد کے ساکن اور حضرت مخدوم اشرف کے جانشینوں میں تھے، ان کے احوال و فضائل راقم سطور کی کتاب "تاریخ بزرگان اشرفیہ" میں بتفصیل مرقوم ہیں، عنقریب چھپنے والی ہے۔

دینیات کے چیرمین تھے، ۳۰ سال کے قیام علی گڑھ کے بعد رمضان ۱۳۵۳ھ میں وہیں انتقال کیا، بے مثال مقرر، متبحر عالم، نڈر اور بے باک حق گو تھے، ان کی تصانیف میں عربی زبان کی فضیلت میں "المبین" اور فارسی شعر و ادب کی تاریخ میں الانہار اور حج کے موضوع پر الحج بہت ہی عمدہ کتابیں ہیں

(۲) مولانا مشتاق احمد کانپوری فرزند اکبر مولانا احمد حسن کانپوری اپنے والد ماجد اور ان کے شاگرد مولانا شاہ عبید اللہ سے درسیات تمام کر کے محدث سورتی سے دورہ حدیث پڑھا، دار العلوم معینیہ اجمیر، مدرسہ شمس العلوم بدایوں، مدرسہ اسلامیہ میرٹھ، جامع نعیمیہ مرادآباد، مدرسہ کبیریہ سہسرام، شمس العلوم پٹنہ اور مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے صدر مدرس رہے، آخر عمر میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل مقرر ہوئے، ان کا شمار ہندوستان کے مشہور علماء و مدرسین میں ہوتا تھا، عید الفطر کی رات کو ۱۳۶۰ھ میں انتقال کیا، تکیہ بساطیان کانپور میں والد ماجد کے حجرہ میں مدفون ہوئے،

(۳) مولانا امجد علی اعظمی محلہ کریم الدین پور گھوسی ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، علامہ ہدایت اللہ خاں سے علوم متعارفہ کی تکمیل کے بعد محدث سورتی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دو سال رہ کر سند حدیث حاصل کی، تکمیل الطب کالج کانپور میں طب پڑھی، تدریس کی ابتدا مدرسۃ الحدیث پیلی بھیت سے کی، وہاں سے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے پاس چلے گئے، مدرسہ منظر اسلام میں تدریس کے ساتھ مولانا بریلوی کی کتابوں کی طباعت کی نگرانی کا کام بھی انجام دیتے تھے، انھیں کے مرید و خلیفہ تھے، فقہ و حدیث اور علوم عقلیہ میں بڑی مہارت تھی، مولانا سلیمان اشرف کے اصرار پر درگاہ اجمیر شریف کے دار العلوم معینیہ عثمانیہ کے صدر مدرس ہو کر گئے، دار العلوم حافظیہ سعیدیہ دادوں علی گڑھ کے بھی

صدر مدرس رہے، مولانا حبیب الرحمن شروانی نے ان کو منتخب علمائے ہند میں شمار کیا ہے[1]، ان کو درسیات پر بے نظیر دستگاہ تھی، ذو قعدہ ۱۳۶۷ھ میں حج و زیارت کو جاتے ہوئے بمبئی میں وفات پائی، ان کی تصانیف میں بہار شریعت اردو میں فقہ حنفی کی معتبر و مستند کتاب ہے، مزید حالات کی تفصیل تذکرہ علماء اہل سنت میں ہے،

(۴) مولانا محمد ظفر الدین ملا محب اللہ صاحب سلم العلوم و مسلم الثبوت کے خاندان کے نامور فرد تھے، ۱۴ محرم ۱۳۰۳ھ کو اپنے وطن میجرہ ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے، فصلی سنہ کے اعتبار سے غلام حیدر تاریخی نام ہے، جس سے ۱۲۹۱ فصلی برآمد ہوتا ہے، اپنے ننہال کے مدرسہ حنفیہ غوثیہ میں پڑھنے کے بعد قاضی عبد الوحید کے مدرسہ میں داخل ہوئے اور مولانا وصی احمد محدث سورتی سے درس شروع کیا، جب دوسرے سال ۱۳۲۱ھ میں محدث سورتی پیلی بھیت واپس گئے تو مولانا ظفر الدین کانپور چلے آئے، اور مولانا احمد حسن کانپوری کے علاوہ ان کے دو نامور شاگردوں مولانا عبید اللہ اور مولانا عبد الرزاق سے اخذ علوم کیا، اس کے بعد پھر پیلی بھیت جا کر محدث سورتی سے اکتساب علم شروع کیا، وہاں سے مولانا احمد رضا خاں کے پاس بریلی پہنچے، اور ان سے بخاری و مسلم کا دورہ کیا، ۱۳۲۵ھ میں سند فراغت مرحمت ہوئی اور مولانا بریلوی کے استاد عارف شاہ حیات احمد رودولوی سجادہ نشین شیخ العالم مخدوم احمد عبد الحق قدس سرہ نے ان کے سر پر دستار فضیلت باندھی، فراغت کے بعد مدرسہ منظر اسلام سے مدرسی کی ابتدا کی، ۱۹۱۳ء میں قیام شمس الہدی پٹنہ کے بعد اس مدرسہ کے مدرس حدیث مقرر ہوئے، اور ۱۹۵۰ء میں پرنسپل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے، ۱۹ جمادی الاخری ۱۳۸۲ھ میں وہیں وفات پائی، مرقد پٹنہ میں ہے، مولانا ظفر الدین کی حدیث میں وسیع اور گہری نظر تھی، انھوں نے

---

[1] رپورٹ دار العلوم حافظیہ سعیدیہ ۱۹۳۳ء ص ۷

مسائلِ احناف کی ماخذ حدیثوں کا مجموعہ جامع الرضوی جو صحیح البہاری کے نام سے مشہور ہے، چھ جلدوں میں مرتب کیا، جلد دوم کے چار جز مطبوعہ ہیں، ان کی نظر ہیئت، توقیت ریاضی اور جفر پر بڑی گہری تھی۔ انھوں نے اوقات صوم وصلوٰۃ کے جو نقشے مرتب کیے وہ ہند وپاک میں بہت مستند مانے جاتے ہیں، ان کی تصنیف توضیح التوقیت چھپ چکی ہے، ان کو بیعت وخلافت مولانا احمد رضا خاں بریلوی سے تھی، انھوں نے ان کے حالات میں چار جلدوں میں "حیات اعلیٰ حضرت" لکھی، اس کی جلد اول چھپ چکی ہے، باقی جلدوں کو ان کے فرزند ارجمند ڈاکٹر پروفیسر مختار الدین احمد آرزو بی، ایچ ڈی، فل، ڈی، لٹ (آکسن) صدر شعبۂ عربی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ مرتب کرکے شائع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں، 'مختار الدین' ان کا تاریخی نام ہے۔

(۵) مولانا عبدالعزیز بجنوری، انھوں نے مولانا احمد حسن امروہوی سے پڑھنے کے بعد محدث سورتی کے مدرسہ میں داخلہ لیا اور فراغت کے بعد انہی کی نگرانی مدرسہ حافظیہ پیلی بھیت میں مدرسی شروع کی، ۱۳۴۲ھ میں مدرسہ منظر اسلام بریلی میں مدرس ہوئے اور ۱۳۵۰ھ میں شیخ الحدیث مقرر کیے گئے، ان کو درس نظامی میں امتیازی وفنی خصوصیت حاصل تھی، ۸ رجمادی الاولی ۱۳۶۹ھ میں بریلی ہی میں انکا انتقال ہوا، ان کے شاگرد مولانا مفتی محمد ابراہیم فریدی شیخ الحدیث مدرسہ شمس العلوم بدایوں نے "آج بزم دل ہوئی بے چراغ" تاریخ سال رحلت کہی، (تذکرہ علمائے اہل سنت ص ۹۴)

(۶) مولانا سید مصباح الحسن ابن مولانا سید شاہ عبدالصمد سہسوانی ۱۳۰۴ھ میں پھپھوند ضلع اٹاوہ میں پیدا ہوئے، والد ماجد اور دیگر علماء سے پڑھنے کے بعد علامہ ہدایت اللہ خاں رامپوری کے پاس جونپور گئے، ۱۳۲۳ھ تا ۱۳۲۶ھ ان سے علوم کی تحصیل کی، اس کے بعد پیلی بھیت جاکر محدث سورتی سے دورہ حدیث کیا، ۱۳۲۸ھ میں سند حدیث حاصل کی، اپنے والد ماجد کے مرید وخلیفہ تھے، بڑے وسیع النظر اور متبحر عالم

محدث، صوفی وعارف تھے، انکے تبحر علمی کا اندازہ ان کے کتب خانہ کی مختلف فنون کی سیکڑوں کتابوں کے ان نوٹس سے ہوتا ہے جو انھوں نے حواشی پر تحریر کیے ہیں، کاکوری کیس میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا، بلکہ بقول مولانا عبدالقدیر بدایونی المتوفی ۱۳۷۹ھ وہ اس کے امیر تھے، مشائخ کاکوری کی شیعی روش پر انکی تنقیدیں بڑی فاضلانہ ہیں جس کا اعتراف اہل علم کو بھی ہے، دو سال مرض فالج میں مبتلا رہ کر ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ کو فوت ہوئے، مرقد پھپھوند ضلع اٹاوہ میں ان کی اپنی خانقاہ میں ہے، راقم سطور نے ان کے احوال، خدمات وفضائل پر "فرید عصر مولانا مصباح الحسن" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے جو جلد ہی چھپنے والی ہے،

(۷) مولانا سید خادم علی ابن مولانا پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری

(۸) مولانا عبدالقادر پشاوری صدر المدرسین دار العلوم نعمانیہ لاہور

(۹) مولانا سید محمد محدث کچھوچھوی

(۱۰) مولانا ضیاء الدین از احفاد ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، سال ولادت ۱۲۹۴ھ، وطن کے علماء سے پڑھنے کے بعد ۱۳۱۲ھ تا ۱۳۱۵ھ مدرسۃ الحدیث میں تحصیل علم کرکے سند فراغت حاصل کی، ۱۳۱۴ھ ہی میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی سے مرید ہوئے، ۱۳۱۸ھ میں ترک وطن کرکے بغداد چلے گئے اور دربار غوث اعظم میں مقیم رہے، ۱۳۲۷ھ سے مدینہ طیبہ میں حاضر ہیں، انکی نگاہ حدیث میں بڑی گہری ہے۔

تذکرہ علمائے اہلسنت ص ۹۸

(۱۱) ماسٹر قاضی تلمذ حسین گوہر گورکھپوری۔

اولاد مولانا عبدالاحد عالم وفاضل اور تنہا اولاد نرینہ تھے، ۱۸۸۳ء میں پیلی بھیت میں پیدا ہوئے مولانا غلام مہر علی نے ۱۸۸۳ء صحیح نہیں لکھا ہے، انھوں نے علوم متعارفہ کی تکمیل

اپنے والد ماجد سے کی اور طب کی تعلیم ۱۹۱۳ء تکمیل الطب لکھنؤ میں پائی، ایک عرصہ تک پیلی بھیت اور پٹنہ میں درس دیا، کچھ عرصہ تک لکھیم پور کھیری میں طبابت کی، بڑے پرجوش اور شعلہ بیان خطیب تھے، درس میں بڑی مہارت تھی، ان کی شادی مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی نواسی بنت مولانا عبدالکریم سے ہوئی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے مرید و خلیفہ تھے، اور انہی کے ہمراہ ۱۳۲۳ھ میں حج و زیارت کے لیے گئے، ۱۳ر شعبان ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء کو لکھنؤ میں وفات پائی، اور گنج مرادآباد میں مولانا عبدالکریم کے برابر آموں کے باغ میں دفن ہوئے،

تصانیف (۱) حاشیہ سنن نسائی (مطبوعہ نظامی کانپور) (۲) حاشیہ طحاوی (مطبوعہ مصر) (۳) التجلی شرح منیۃ المصلی (مطبوعہ یوسفی لکھنؤ) جلالین و مشکوٰۃ کے حواشی مولانا سردار احمد لائل پوری سابق شیخ الحدیث مدرسہ منظر اسلام بریلی ان کی اہلیہ سے طباعت کے وام لے گئے تھے، پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کیا ہوئے اور اب کس کے پاس ہیں (۶) کتاب الدرہ فی تحت عقد الایدی تحت السرہ (۷) جامع الشواہد باخراج الوہابیین عن المساجد،

وفات ۸ر جمادی الاخری ۱۳۳۴ھ کو وفات پائی، مدرسۃ الحدیث کے قریب مسجد کے احاطہ میں اس مجسمۂ فضل و کمال کا جسد خاکی سپرد خاک کر دیا گیا، مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے "یطاف علیھم بآنیۃ من فضۃ واکواب" سے تاریخ نکالی، اور انھوں نے فرمایا تھا کہ اگر اس میں "واو" شامل کر دیا جائے تو میری تاریخ ہو جائی گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور انھوں نے ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی،

مقالہ نما

مضامین الندوہ

از مولوی سلیمان شمسی صاحب ندوی

(۳)

ادبیات

اکرام اللہ خاں ندوی — جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ

(۱) عربی کا اثر دیگر السنہ پر — ص ۹ - ۱۵ حوالہ ۲۸۵

فارسی، ترکی اور یورپین زبانوں پر عربی زبان و ادب کے اثرات اور عجمی ممالک کے سماجی رسم و رواج پر عربی کی چھاپ کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے،

(۲) فارسی زبان کی گذشتہ تاریخ پر ایک نظر — جون ۱۹۱۵ء

ص ۱ - ۱۱ حوالہ ۲۸۵

فارسی زبان کی گذشتہ تاریخ سے بحث کی گئی ہے، اور اس کے عہد بعہد کے ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے،

(۱) سلیمان ندوی (سید علامہ)

عربی زبان کی مختصر تاریخ — شوال ۱۳۳۲ھ

(ماخوذ از اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان) ص ۱۴ - ۲۲ حوالہ ۲۷۹/۱

"زبان عربی کی تاریخ آفرینش کا پتہ نہیں لگتا، اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس زبان سے نکلی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ زبان سامی یا آرامی سے پیدا ہوئی ہے جس کی

تین شاخیں کلدانی، عبرانی، نبطی بھی ہیں، عربی زبان کے اسماء و افعال، حروف، اشتقاقات اسی وقت مدون ہو چکے تھے، جب وہ آغوش مادر "سامی" میں تھی اور اسماء و حروف و اشتقاقات بھی اس سے پہلے کہ اس زبان والے متفرق ہوں یا فینقیہ اور جزیرہ عرب اور ماوراء النہرین میں جا کر بسے ہوں"۔

(۲) عربی زبان کی وسعت — جولائی ۱۹۰۷ء

ص ۵ - ۲۰ حوالہ ۲۷۹/۴

"عربی زبان کی تاریخ" اس زبان کے علمی سرمایہ کا جائزہ اور دنیا میں عربی بولنے والوں کی تعداد کے جائزہ کے ساتھ اس کی وسعت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شبلی نعمانی (علامہ) — اپریل ۱۹۰۹ء

(۱) ایرانی شاعری کا دور آخر — ص ۳ - ۲۴ حوالہ ۲۷۹/۶

[شعر العجم جلد ۳ سے اقتباس] دور آخر کا جائزہ

(۲) فارسی شاعری اور عرفی شیرازی — شعبان ۱۳۲۳ھ

ص ۱ - ۵ حوالہ ۲۷۹/۲

عرفی کا باپ شیراز کے دار الحکومت میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز تھا، عرفی نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص عرفی رکھا، عرفی کی تعلیم و تربیت شیراز میں ہوئی، عرفی نے معمولی علوم کے ساتھ مصوری اور نقاشی کی بھی تعلیم پائی تھی، — "شخصیت اور شاعری کا جائزہ"۔

(۳) عربی و فارسی شاعری، — اپریل ۱۹۰۸ء

ص ۱۴ - ۲۱ حوالہ ۱۷۹/۵

عربی و فارسی شاعری کا موازنہ

(ماخوذ از شعر العجم)

(۴) فلسفہ اور فارسی شاعری — ستمبر ۱۹۰۷ء

ص ۳ - ۱۰ حوالہ ۲۷۹/۴

سحابی نجفی کی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے،

"شعر العجم سے ماخوذ ہے"

(۵) مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ — مارچ ۱۹۰۷ء

ص ۹ - ۲۷ حوالہ ۲۷۹/۳

عرب میں جو فارسی اور اردو شاعری کا سرچشمہ ہے، شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی اور یہی ہونا چاہیے تھا، عرب میں شاعری بالکل فطرت کے اصول پر ہوئی ہے، یعنی جو جذبات دل میں پیدا ہوتے تھے وہی زبان سے ادا کر دیے جاتے تھے۔

[موازنہ انیس و دبیر سے اقتباس]

عبد الرحمٰن صاحب — جون ۱۹۱۲ء

عرب کی شاعری — ص ۲۹ - ۳۲ حوالہ ۲۷۹/۹

مشہور مورخ ابو داؤد نے لکھا ہے کہ تمام ملک عرب کی چھان بین کر ڈالی جائے تو بہت مشکل سے کوئی ایسا شخص ملے گا جس کو شعر گوئی کا تھوڑا بہت سلیقہ نہ آتا ہو کیا بچہ کیا جوان کیا بڈھا، کیا مرد کیا عورت سبھی اس دریا کے غوطہ خور تھے، اور شاعری ان کے خمیر میں تھی،

عبد الماجد (دریابادی) مترجم — اپریل ۱۹۱۱ء

شاعری اور اس کے اصناف — ص ۱ - ۱۲ حوالہ ۲۷۹/۸

"شاعری کا مقصد جیسا کہ ہر شخص کو تسلیم ہے، جذبات پر اثر ڈالتا ہے، اور یہی ایک

خصوصیت شاعری کو (بقول ورڈزورتھ) اس کے منطقی نقیض سے ممتاز کر دینے کیلیے
کافی ہے، جو نثر نہیں بلکہ سائنس ہے، شاعری اپنا مخاطب جذبات کو قرار دیتی ہے اور
سائنس یقین کو، آخر الذکر استدلال سے کام لیتا ہے اور اول الذکر محرکات سے"۔
لیکن شاعری کی یہ تعریف مکمل نہیں ......!
یورپ میں آجکل شاعری کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، ان میں ڈی کا مضمون
بسیط ہے، اسی کے ایک ٹکڑہ کا ترجمہ ہے۔

عمادی - عبد اللہ

"ادب الہند یعنی اسلام میں ہندی لٹریچر کا رواج"۔ جمادی الاولی

ص ۲۰ - ۲۸ حوالہ ۲۷۹/۲

اسلامی تاریخیں بتا رہی ہیں کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں کتابیں ترجمہ
کیں، ہندوستان میں اس وقت آکر رہے ہیں، جب ہندو مسلمانوں کے نام سے
بھی آگاہ نہیں تھے، سنسکرت میں مہا بھارت پیدا کی، شاستر کی کتابیں لکھیں پڑھیں
ہندوؤں کے علوم میں اضافہ کیا، اور علاوہ ترجمہ کتب ہندیہ کے عربی کتابیں بھی ہندی
میں ترجمہ کیں اور اس طرح ہندوؤں کو نہایت عمدہ موقع دیا کہ وہ مسلمانوں سے
تعلقات قائم کر سکیں،

تعارف تنقید و تبصرہ

آزاد - ابوالکلام (مولانا) رمضان ۱۳۲۳ھ تا ذی الحجہ

المرأۃ المسلمۃ ص ۱۴ - ۲۷ حوالہ ۲۷۹/۲

فرید وجدی کی کتاب المرأۃ المسلمۃ کا تنقیدی جائزہ،

فرید وجدی چونکہ یورپ کی متعدد زبانوں سے واقفیت رکھتا ہے اور خود
تعلیم یافتہ سوسائٹی کا ایک فاضل ممبر ہے، اس لیے اس نے جو کچھ لکھا ہے محض یورپ کے
اقوال و حالات کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ "المرأۃ المسلمۃ" جس قدر
نئے گروہ پر اثر ڈال سکتی ہے، ہمارے یہاں کی مذہبی تحریروں سے اس قدر توقع نہیں
ہو سکتی،

اکرام اللہ خاں ندوی اپریل ۱۹۱۵ء

ایک جدید تاریخی کتاب ص ۱۶ - ۲۷ حوالہ ۲۸۵

"جنۃ المشرق"

حکیم سید عبد الحی صاحب مرحوم مصنف نزہۃ الخواطر کی کتاب جنۃ المشرق
کا تعارف،
اس کتاب کے چار حصے ہیں، پہلے حصہ کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کا قدیم
و جدید جغرافیہ مختلف حیثیتوں سے دکھایا جائے، دوسرا حصہ تاریخ میں ہے، تیسرا حصہ
اس کتاب کا الخطط والآثار ہے، اس میں تین باب ہیں اور یہی اس کتاب کی جان ہے"

انور محمد ندوی

ایک نادر قلمی تفسیر " منتہی العلوم فی تفسیر کتاب الحی القیوم

ستمبر ۱۹۲۰ء

ص ۲۸ - ۳۱ حوالہ ۲۸۷

پیش نظر نسخہ [illegible] میں یعنی مصنف کی وفات سے چار برس پہلے لکھا گیا ہے،
عبداللہ المرعی مصنف کے تلمیذ رشید نے اسی نسخہ سے مصنف سے پڑھا تھا، اور انکے

علاوہ علمائے سلف کی ایک کثیر تعداد نے اس سے استفادہ کیا، ان سب کے نام عبداللہ المرعی کے قلم سے کتاب کے آخر صفحہ پر لکھے ہوئے ہیں،

سلیمان ندوی (سید علامہ) مارچ ۱۹۰۹ء

(۱) "نہایۃ الارب" ص ۳۰ - ۳۲ حوالہ ۲۷۹/۱

نہایۃ الارب علامہ نویری کی مشہور تصنیف ہے، جو تیس جلدوں میں ختم ہوئی ہے، اور جامعیت کے لحاظ سے ہر قسم کے علوم و فنون کا مجموعہ ہے، فن اول فلکیات، ارض، عنصریات۔ فن دوم انسان اور اس کے متعلقات، فن سوم حیوانات اور فن پنجم تاریخ پر مشتمل ہے،

(۲) تمدن اسلامی مصنفہ جرجی زیدان اکتوبر ۱۹۰۵ء

ص ۱۵ - ۲۴ حوالہ ۲۷۹/۵

جرجی زیدان کی کتاب پر تبصرہ ہے، اس میں مصنف کی فریب کاری کا پردہ چاک کیا گیا ہے،

(۳) "ایک جرمن کا اسلام پر لکچر" دسمبر ۱۹۱۱ء

موسیو مونٹیٹ کے لکچر کے اقتباس ص ۲۳ - ۳۰ حوالہ ۲۷۹/۸

ہم نے اسباب اشاعت اسلام کے بیان میں اختصار سے کام لیا، ہمارے نزدیک اشاعت اسلام کے قوی اسباب وہی دو ہیں، یعنی مسلمانوں کا اخلاص اور شدت اعتقاد، جوش مذہبی اور عربوں میں قومی و وطنی احساس کا پیدا ہونا، یہی دو سبب ہیں جو اسلام کی اشاعت میں کام کرتے ہیں،

(۴) کتب خانہ اسکندریہ دسمبر ۱۹۱۱ء

ص ۲۳ - ۳۰ حوالہ ۲۷۹/۸

لندن کے اخبار "ٹائمز" میں ایک مضمون نگار نے جرجی زیدان کی تصنیف "تاریخ مصر جدید" کے حوالہ سے کتب خانہ اسکندریہ کی نسبت کہا تھا کہ وہ مسلمانوں ہی کی راہ سے برباد ہوا، مسٹر ٹیلر نے ۲۵ جون ۱۹۱۱ء میں اس مضمون کی دھجیاں اڑائی ہیں، اسی مضمون کی روشنی میں بعض تاریخی واقعات پر بحث کی گئی ہے،

(۴) طبقات ابن سعد مارچ ۱۹۱۲ء

ص ۳۱ - ۳۲ حوالہ ۲۷۹/۹

طبقات ابن سعد تمام مورخین کے نزدیک نہ صرف معتبر ثقہ اور مستند ہے بلکہ اس عہد کے بعد کی تمام تصنیفات کی مرکز نقل و روایت ہے، تمام مورخین اپنی کتابوں میں اس کا حوالہ دیتے ہیں، اس موضوع پر کوئی اس کی برابری کا دعویٰ نہ کر سکا، ..... اس جلیل القدر کتاب کا نسخہ کسی ایک کتب خانہ میں بھی مکمل موجود نہ تھا، آخر کار ایک جرمن فاضل پروفیسر "ساخو" نے اس کتاب کو چھاپنے کی ہمت کی،

شبلی نعمانی (علامہ) مارچ ۱۹۱۱ء

(۱) لغت فرس، از اسدی طوسی، ص ۳ - ۶ حوالہ ۲۷۹/۲

اسدی کو تمام دنیا صرف شاعری کی حیثیت سے جانتی ہے، یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ فارسی لغت کا سب سے پہلا مدون ہے، اس نے اپنی کتاب کا نام لغت فرس رکھا ہے، اور صرف نادر اور غریب الفاظ جمع کیے ہیں، یورپ کے ایک مشہور مستشرق پاول ہارن نے آٹھ برس کتاب کی تصحیح و تحشیہ میں صرف کیے اور ۱۸۹۷ء میں اس کو شائع کیا۔

(۲) نظم القرآن و جمہرۃ البلاغہ شوال ۱۳۲۲ھ

ص ۱ - ۴ حوالہ ۲۷۹/۲

مولوی حمید الدین صاحب نے اسی مسئلہ پر کتاب لکھی ہے، اور وہ اس رائے کے مدعی ہیں کہ ایک سورت میں جس قدر آیتیں ہیں، باہم متناسب ہیں۔۔۔۔اسی بنا پر مصنف نے اصل فن پر توجہ کی، اور اس کو نہایت وسیع پیمانہ پر نئے سر سے ترتیب دیا، اور فصاحت و بلاغت کے بہت سے جدید اصول قائم کیے، اسی طرح ایک اور مستقل کتاب تیار ہو گئی جس کا نام انھوں نے "جمہرۃ البلاغۃ" رکھا۔

(۳) کتاب العمدۃ ابن رشیق القیروانی، نومبر ۱۹۰۹ء

"شعر العرب"

ص ۱-۱۰ حوالہ ۲۷۹/۴

ابن رشیق افریقہ کا رہنے والا تھا، اس کا باپ ایک رومی غلام تھا، اور زرگری کا پیشہ کرتا تھا، باپ نے ابتداء میں خاندانی پیشہ سکھلایا لیکن اس نے اس کے ساتھ علوم ادبیہ کی بھی تحصیل کی اور یہ مذاق غالب آیا۔

کتاب اور صاحب کتاب کے تعارف کے ساتھ موضوع پر بھی روشنی ڈالی گئی، اور کچھ اقتباسات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے

(۴) ہمایوں نامہ۔ گلبدن بیگم اپریل ۱۹۰۸ء

ص ۳-۱۳ حوالہ ۲۷۹/۴

گلبدن بیگم بابر کی بیٹی، ہمایوں کی بہن اور شہنشاہ اکبر کی پھوپھی تھی، اس نے بابر اور ہمایوں کے حالات میں ایک کتاب لکھی، اور ہمایوں نامہ نام رکھا، ہمایوں نامہ چونکہ ایک خاتون کی تصنیف تھی، یورپ کی خوش مذاقی نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے ایک خاتون ہی کو انتخاب کیا، یعنی لیڈی اینٹ، ایس بیورج کو اسی کتاب کو بہم پہنچانے کا خیال ہوا۔

(۱) سیرت نبوی جنوری ۱۹۱۲ء

ص ۵-۸ حوالہ ۲۷۹/۹

"سیرۃ النبی" کی تکمیل سے پہلے کا مجوزہ خاکہ پیش کیا گیا ہے، اور اس کام کی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۶) "مآثر رحیمی اور عبدالرحیم خانخاناں"۔ اپریل ۱۹۰۷ء

ص ۱-۱۶ حوالہ ۲۷۹/۴

ایشیاٹک سوسائٹی میں مآثر رحیمی کا ایک نسخہ نظر سے گذرا، یہ کتاب عبد الرحیم خانخاناں کے حالات میں ہے، جو اکبر شاہ کا سپہ سالار تھا، مصنف کا نام عبدالباقی ہے، جو ایران کا باشندہ اور ایک معزز خاندان کا ممبر تھا، کتاب خود خانخاناں کی زندگی میں لکھی گئی۔

(۷) تلفیق الاخبار دسمبر ۱۹۱۱ء

ص ۲-۸ حوالہ ۲۷۹/۸

یہ ایک ضخیم کتاب ہے، جو خاص ترک و تاتار کی تاریخ میں ہے جو ایک روسی مسلمان کی تصنیف ہے۔۔۔۔مصنف تاتاری ترک ہے، اور قومیت کے نشہ میں چور ہے، چنگیز خاں کی برائی پر تمام دنیا کو متفق اللفظ سنتے آئے لیکن مصنف اس اجماع میں بھی شامل ہونا گوارا نہیں کرتا۔

(۸) "تفسیر کبیر امام رازی" (ریویو) مئی ۱۹۰۸ء

ص ۵-۱۰ حوالہ ۲۷۹/۵

یہ امر افسوسناک ہے کہ یہ محقق معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں تک اصل تفسیر ہے اور

کہاں سے تکملہ شروع ہوا ہے۔ شہاب نے شفائے قاضی عیاض کی شرح میں لکھا ہے کہ امام نے صرف سورہ انبیاء تک تفسیر لکھی، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، سورہ فتح تک امام صاحب کی تفسیر کا لکھا جانا یقینی ہے،

(۹) تحفۃ الہند فروری ۱۹۱۱ء

ص ۳ - ۱۰ حوالہ $\frac{۲۷۹}{۸}$

"تحفۃ الہند" جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے، ایک کتاب کا نام ہے، جو اورنگزیب عالمگیر کے زمانہ میں تصنیف ہوئی۔ مصنف کا نام میرزا خان بن فخرالدین محمد ہے، دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب شاہنشاہ عالمگیر کے زمانہ میں شہزادہ اعظم شاہ کے مطالعہ کے لیے تصنیف کی، کتاب کا موضوع ہندوؤں کا فن بلاغت اور عروض و قافیہ وغیرہ ہیں،

(۱۰) "الملل والنحل اور علامہ ابن حزم" اکتوبر ۱۹۰۵ء

ص ۱۶ - ۲۲ حوالہ $\frac{۲۷۹}{۲}$

اس کتاب میں مصنف نے فلاسفہ، ملاحدہ، مادیین، یہود و نصاریٰ، غرض اکثر اہل مذاہب کے عقائد و خیالات نقل کیے ہیں، اور ان کا رد لکھا ہے، غیر مذاہب کے رد میں علمائے اسلام کی بہت سی تصنیفات ہیں، لیکن اس کتاب میں یہ خصوصیت ہے کہ دوسروں کے عقائد و خیالات کو نہایت تحقیق سے لکھا ہے،

کتاب کا علمی جائزہ

شروانی، حبیب الرحمن خاں اکتوبر ۱۹۰۶ء

ریویو، سوانح عمری مولانا روم ص ۲۴ - ۳۲ حوالہ $\frac{۲۷۹}{۴}$

مثنوی کے مطالب اور عام افہام کے درمیان جو دور دراز مسافت حائل تھی اسکے کم ہوجانے کا ایک ذریعہ خوبی قسمت سے ہاتھ آگیا ہے، علامہ شبلی نے سوانح مولانائے روم

تصنیف کر کے اس کے ضمن میں مثنوی پر ایک مکمل تبصرہ لکھا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ تبصرہ کے ضمن میں سوانح عمری تصنیف کی ہے،

عبدالسلام ندوی (مولانا) جنوری ۱۹۱۱ء و فروری

"اخبار الحکماء قفطی" ص ۱۳ - ۲۲ - ۲۳ - ۳۴ حوالہ $\frac{۲۷۹}{۸}$

اس کتاب کے مصنف کا پورا نام جمال الدین الاکرم ابوالحسن علی بن یوسف بن ابراہیم الشیبانی القفطی ہے، اس کا خاندان اگرچہ اصل کوفہ سے تعلق رکھتا تھا، لیکن وہاں سے نکل کر مصر کے ایک گاؤں قفط میں آباد ہو گیا تھا ... مصنف نے اگرچہ کتاب صرف حکماء کے حالات میں لکھی ہے لیکن ان ہی کے ضمن میں ایسے دلچسپ فلسفیانہ نکتے بھی جمع کیے جن سے مسلمانوں کے فلسفہ کی پوری تاریخ مرتب ہو سکتی ہے،

(۲) روح الاجتماع۔ گستاولی بان مارچ ۱۹۱۱ء

ص ۶ - ۲۴ حوالہ $\frac{۲۷۹}{۸}$

"زیر ریویو کتاب فلسفہ کی ہمہ گیری کے لحاظ سے فلسفہ جماعت کے متعلق لکھی گئی ہے، پروفیسر گستاؤلی بان جو فرانس میں علم النفس کا بہت بڑا ماہر تسلیم کیا جاتا ہے، اور جس کی کتاب تمدن عرب اور تمدن ہند کے ترجمے نے اس کو ہندوستان میں بھی مشہور کر دیا ہے، اس کتاب کا مصنف ہے۔

بعض اقتباسات کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے،

(۳) "صحیح مسلم" دسمبر ۱۹۰۶ء و جنوری ۱۹۰۷ء

ص ۱۳ - ۳۲ حوالہ $\frac{۲۷۹}{۴}$

امام مسلم اور ان کی کتاب جامع صحیح مسلم کی عظمت پر مضمون۔

بخاری کا نام کتاب اللہ کے بعد لیا جاتا ہے، تو مسلم بھی ہمیشہ بخاری کے ساتھ یاد کیجاتی ہے، اس لیے اس کتاب پر ایک مفصل ریویو کی ضرورت ہے، تاکہ اس کی خوبیاں عام طور پر نمایاں ہو جائیں،

عبد السمیع صاحب ایم، اے، بی، ٹی — دسمبر ۱۹۴۱ء و جنوری ۱۹۴۲ء

روسو کا نظریۂ تعلیم — ص ۲۷ - ۳۱ — حوالہ نمبر ۲۸/۲

تعلیم نسواں کے بارے میں انفرادی تعلیم کے اصول سے انحراف کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ عورت کی تعلیم صرف مرد کی خاطر ہونا چاہیے، جسمانی تربیت ہو تاکہ حسن ظاہری اور تناسب اعضا پیدا ہو اور نسل انسانی میں اچھے قوی کے بچے پیدا ہوں، اسکے سوا اور کوئی تعلیم ضروری نہیں،

عبد الماجد دریابادی — اکتوبر ۱۹۴۱ء

"الندوہ" پڑھکر — حوالہ نمبر ۲۸/۲

علوی، پروفیسر بدر الدین — مئی ۱۹۴۰ء

"تقویم البلدان" — ص ۱۲ - ۱۴ — حوالہ ۲۸۷

آج سے پورے سو سال پیشتر ۱۸۴۰ء میں تقویم البلدان کو فرانسیسی پروفیسر رینا اور بیرن دی سلین نے اپنے اہتمام سے پیرس میں چھاپا تھا، مستشرقین کے طریقہ کے موافق آخیر میں ایک مقدمہ فرانسیسی زبان میں لکھا ہے، اور فہرست مضامین اور فہرست امکنہ لگائی گئی ہے"

عمادی عبد اللہ — ستمبر ۱۹۰۸ء

"تاریخ ابن خلدون" — ص ۳ - ۲۲ — حوالہ ۲۷۹/۵

ابن خلدون نے تاریخ نویسی کے لیے چند اصول قرار دیے ہیں اور ایک ضابطہ

مقرر کیا ہے، ان اصول میں حاضر وغائب کے اتفاق واختلاف سے یہ مراد ہے کہ موجودہ زمانہ چونکہ قدیم زمانہ کے واقعات کا نتیجہ ہے لہذا موجودہ اور گذشتہ امور پر غور کرنا چاہیئے کہ ان میں کتنی باتیں باہم ملتی جلتی ہیں اور کس قدر مختلف ہیں، تاریخ کی موجودہ تعریف اسی ضابطہ سے استنباط ہوئی ہے"

عمادی عبد اللہ — ستمبر ۱۹۰۸ء

"فرید وجدی بک" — ص ۲۵ - ۲۷

حوالہ ۲۷۹/۵

ایک عجیب بات ہے کہ باوجود تعلیم جدید کے عورتوں کی آزادی اور خودمختاری کے متعلق اس کے خیالات جدید تعلیم کے بالکل مخالف ہیں، قاسم بک امین کی کتاب تحریر المرأۃ کا اس نے جو جواب لکھا وہ درحقیقت لاجواب تھا،

عمادی عبد اللہ — ستمبر ۱۹۰۸ء

بلاغات النساء — ص ۲۲ - ۲۵ — حوالہ ۲۷۹/۵

تیسری صدی ہجری کی ایک تصنیف ہے جس میں عورتوں کی تقریریں اور خطبے جمع کیے ہیں قدما، کی گمشدگی کی وجہ سے اسلامی تمدن، اسلامی اخلاق بلکہ خود شریعت اسلام کی جو تصویر ہمارے سامنے ہے، اس قدر اصلیت سے دور ہے کہ صحیح خط وخال کا تصور کرنا آج بھی مشکل ہے۔

نذیر احمد، شمس العلماء — نومبر ۱۹۰۵ء

"فرائض انسانی" — ص ۳۰ - ۳۲ — حوالہ ۲۷۹/۵

شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی آخری تصنیف ہے اس میں عبارات کے تمام ابواب نہایت تفصیل اور بسط سے لکھے ہیں، مصنف کے طرز بیان نے فقہ کے رکھے پھیکے مسائل کو بھی دلچسپ بنا دیا ہے، کتاب کے بعض اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔

(باقی)

مطبوعاتِ جدیدہ

خواجہ میر درد تصوف اور شاعری } مرتبہ ڈاکٹر وحید اختر صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۵۸۳ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۵ پتہ: انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔

خواجہ میر درد جس درجہ کے شاعر تھے، اس سے بلند درجہ کے صوفی تھے، اور شاعری کے بجائے تصوف ہی کو اپنے لیے مایہ فخر سمجھتے تھے، تصوف میں ان کا بڑا کارنامہ اس خاص سلسلہ "طریق محمدی" کی تشریح ہے، جو ان کے والد خواجہ ناصر عندلیب پر منکشف ہوا تھا، مگر اس کے باوجود اس کی جانب کم اعتنا کیا گیا ہے، لائق مصنف نے اس کو اپنے تحقیقی مقالہ کا موضوع بنایا تھا جس کو اب رد و بدل کر کے کتاب کی صورت میں مرتب کیا ہے، یہ دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں خواجہ صاحب کے عہد تک کے عام صوفیانہ نظریات کا جائزہ اور ان پر ان کی تنقیدوں کا ذکر ہے، اس ضمن میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی اہم بحثوں کے متعلق بعض اکابر صوفیہ کے نقطۂ نظر کی تشریح کی گئی ہے، اور آخر میں خواجہ صاحب کے خاص صوفیانہ افکار و نظام کی وضاحت ہے، دوسرے حصہ میں فارسی اور اردو شاعری میں تصوف کے عام اثرات و رجحانات کا جائزہ لینے کے بعد خواجہ صاحب کی صوفیانہ شاعری کے مختلف پہلوؤں اور تغزل کے خصوصیات اور شاعری میں انکی جدت و انفرادیت وغیرہ کا ذکر ہے، یہ حصہ درد کے تلامذہ کے تذکرہ پر ختم ہوتا ہے، شروع میں خواجہ صاحب کے عہد، حالاتِ زندگی اور تصنیفات کا ذکر ہے، مگر اولاً تو کتاب کا موضوع ہی خشک ہے، دوسرے مصنف

نے دونوں حصوں کی تمہید اتنی طویل کر دی ہے کہ اصل موضوع تک پہنچنے سے پہلے ہی عام قاری کو گھبراہٹ ہونے لگتی ہے، کہیں کہیں جگہ صوفیہ اور خود درد کی رواداری اور وسیع المشربی کا اس انداز سے ذکر کیا گیا ہے کہ گویا ان بزرگوں کے نزدیک کفر و ایمان اور حق و باطل میں امتیاز کا کوئی معیار نہ تھا، جو صحیح نہیں، مصنف نے براہ راست اصل کتابوں کے بجائے ضمنی اور ثانوی مآخذ کا حوالہ دے کر اس کتاب کا تحقیقی پایہ ہلکا کر دیا ہے، راقم کے سامنے جو نسخہ ہے اس میں صفحات ۵۰۹ تا ۵۱۲ شامل نہیں ہیں، اور ۵۱۳ تا ۵۲۰ مکرر ہیں، ان باتوں سے قطع نظر یہ کتاب لائق مطالعہ ہے، اس میں درد کے تصوف و شاعری کے کمالات کو بڑی حد تک واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شعر و شعور: مرتبہ جناب حفیظ میرٹھی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۴۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳ پتہ مکتبہ دوام، ٹانڈہ، فیض آباد،

جناب حفیظ میرٹھی خوش فکر شاعر اور ادارۂ ادب اسلامی سے وابستہ ہیں، یہ رنگ انکے پورے کلام سے نمایاں ہے، اسی لیے وہ اپنے مقصد کو فن سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، ان کا قلب مومن اپنی زریں تاریخ کے ذریعہ دنیا کی تعمیر نو کا عزم اور اس کے لیے دار و رسن سے کھیلنے کا حوصلہ رکھتا ہے، ان کے خیالات کی طرح انداز بیان میں بھی اقبال کے کلام کی جھلک ملتی ہے، مثلاً

بہت اس سے اونچی ہے پرواز میری — میں ہرگز نہیں بندۂ آب و دانہ
اس اک مرکز دین و دنیا سے ہٹ کر — نہ تیرا ٹھکانا، نہ میرا ٹھکانا
نہ ٹھہر ماضی و حال کی الجھنوں میں — صداقت نہیں ہے اسیر زمانہ
کوئی مرحلہ ہو، کوئی معرکہ ہو — نظر عارفانہ، قدم غازیانہ

شعر و شعور حفیظ صاحب کا پہلا مجموعہ ہے، اور غالباً انکی نظر ثانی کے بغیر شائع کر دیا گیا ہے، اسلئے بعض اشعار میں ناہمواری رہ گئی ہے، لیکن ان کے جذبات کی صداقت و خلوص اور افکار و خیالات کی رفعت نے کلام میں سوز و تاثیر پیدا کر دی ہے۔

چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں۔ مرتبہ مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی تقطیع خورد کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۵۸ قیمت پانچ روپے پتے (۱) فرقانیہ اکیڈمی پک باباد بنگلور، نارتھ (۲) آئیڈیل بک سنٹر اوینیو روڈ۔ بنگلور ۲ء

سائنس کی موجودہ ترقیوں خصوصاً خلائی پرواز اور چاند کی تسخیر نے جو شکوک و شبہات پیدا کر دیے ہیں، ان کے ازالہ کے لیے اردو میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر ان سب میں زیر نظر کتاب زیادہ مبسوط ہے، اس کے لائق مصنف نے دقت نظر سے قرآن مجید کا مطالعہ بھی کیا ہے، اور وہ ایک حد تک جدید نظریات سے بھی واقف ہیں، اس لیے انھوں نے ان دونوں کی روشنی میں یہ دکھایا ہے کہ تسخیر قمر اور اس طرح کے دوسرے سائنسی انکشافات قرآنی تصریحات کے منافی نہیں ہیں بلکہ درحقیقت قرآن کے اعجاز وصداقت کی دلیل اور ایمان ویقین میں اضافہ و پختگی کا موجب ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے بعض آیتوں سے بڑے دلچسپ نکتے اور مفید حقائق اخذ کیے ہیں، اصولی حیثیت سے انکا نقطہ نظر بالکل صحیح ہے مگر اس کو ثابت کرنے اور بعض مزعومات کی تردید کے لیے انھوں نے بعض آیتوں سے جو نتائج مستنبط کیے ہیں، ان سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، مصنف کی یہ پہلی کتاب ہے، اس لیے تکرار، طوالت اور حشو و زوائد سے خالی نہیں ہے، اور اکثر جگہ جذباتی اور مناظرانہ رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے، مگر ان فروگذاشتوں کے باوجود یہ مفید اور معلوماتی ہے، ہونہار مصنف کا وقت کے اس اہم اور ضروری مسئلہ پر توجہ کرنا حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔ شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ایک مفید مقدمہ بھی ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۹ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۲ء عدد ۶

مضامین